Phone : 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی 1964

بیادِ اقبالؒ

شائع کردہ: ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت ایک روپیہ

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماهنامہ طلوع اسلام لاهور

ٹیلیفون نمبر	قیمت فی پرچہ	بدل اشتراک
(۸۰۸۰۰) خط و کتابت کا پتہ ناظم طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاهور	پاک و ہند سے ایک روپیہ	پاک و ہند سے سالانہ - دس روپے غیر ممالک سے سالانہ — ایک پونڈ

جلد ۱۷ — مئی ۱۹۶۴ء — نمبر ۵

فہرست مضامین

۱- لمعات — (۲۱ - اپریل کی یادیں) — ۲

۲- مجلس اقبالؒ — ۱۷

۳- باب المراسلات - (۱) غیر مسلموں کے نیک اعمال کا بدلہ (۲) اخلاقی اور روحانی ترقی (۳) اسلامی قوانین کب بنیں گے (۴) تعلق باللہ (۵) حقوق اللہ و حقوق العباد (۶) چار سوالات اور ان کا جواب — ۲۵

۴- روایات کا مقام قرآن - (قسط دوم) - علامہ السید احمد السیفی (ترجمہ سید نعیم شاہ صاحب) — ۴۱

۵ - طاؤس و رباب آخر — ۵۸

۶ - رابطہ باہمی - (۱) اراکین بزم ہائے طلوع اسلام کی خدمت میں (۲) میری مصروفیتیں (۳) ایک قرآنی دوست کی چٹھی — محترم پرویز صاحب — ۶۵

۷- نقد و نظر - الخطبات الاحمدیہ — ۷۳

۸- حکمت ولی اللہی — ۷۵

۹- بچوں کا صفحہ — ۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۲۱ - اپریل کی یاد میں

۸ - اپریل ۱۹۳۸ء کو طلوع اسلام کے دورِ جدید کا پہلا شمارہ منظرِ اشاعت پر آیا۔ یہ پرچہ ابھی تقسیم نہ ہونے پایا تھا کہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کے سانحۂ رحلت نے فلسفہ و حکمت کی بارگاہوں میں بالعموم اور عالمِ اسلام کے طول و عرض میں بالخصوص ماتم کی صفیں بچھا دیں۔ علامہ مرحوم سے طلوع اسلام کا قلب و نگاہ کا کس قدر گہرا رشتہ قائم تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یہ نام خود حضرت مرحوم و مغفور نے تجویز کیا اور ادارہ کی طرف سے پہلے ہی شمارہ میں یہ الفاظ ذیل اس جریدہ کی پیشکش ان کے حضور میں کی گئی۔

ہم کمالِ عقیدت و نیازمندی کے ساتھ رسالہ "طلوع اسلام" کو ترجمانِ حقیقت حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ مدظلہ العالی کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کرتے ہوئے آرزو رکھتے ہیں کہ جس طرح نئی روشنی کی پیدا کردہ تاریکی میں ان کا جلوۂ فکر آفتابِ اسلام کے نئے طلوع کا باعث ہوا ہے اسی طرح یہ رسالہ ان کے پرتوِ افکار سے حقیقی معنوں میں اسم بامسمّٰی ثابت ہو۔ "طلوع اسلام" نہایت ادب سے ان کے حضور میں متقاضی ہے کہ

مدار جلوہ دریغ از دلم کہ خرمنِ حسن
ز خوشہ چینیٔ آئینہ کم نمی گردد

اسی شمارہ میں ادارہ طلوع اسلام کو حضرت علامہؒ کی یہ تازہ ترین غیر مطبوعہ رباعی شائع کرنے کا بھی شرف حاصل ہوا کہ

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر — روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر — از نگاہِ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

اس پرچہ کے افتتاحیہ میں ادارہ نے علامہ اقبالؒ کی گراں قدر شخصیت کو مبداءِ فیض کی کرم گستری قرار دیتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ

> اس پرچہ کی خوش نصیبی ہے کہ پیامِ اقبالؒ کی نشر و اشاعت اس کا مقصد ہوگا۔ آج ملتِ اسلامیہ کی زندگی کا راز اس پیام کے اندر ہے کہ یہ پیام دراصل قرآن کریم کا پیام ہے۔ حضرت علامہ مدظلہ العالی کی باریک بین اور دور رس نگاہیں حقائقِ قرآن کو سمجھنے میں جن بلندیوں تک پہنچ چکی ہیں ان سے کوئی دیدہ ور ناواقف نہیں۔ ملتِ اسلامیہ اللہ تعالیٰ کی اس موہبتِ عظمیٰ پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔

یہ تھیں وہ اُمنگیں اور آرزوئیں جو طلوعِ اسلام نے اپنی اشاعت کے سلسلے میں حکیم الامت کی ذاتِ گرامی سے وابستہ کیں لیکن آہ! ع

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

طلوعِ اسلام کا پہلا شمارہ اس شدتِ آرزو کو لئے حضرت علامہ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ یہ پہلا اور آخری شمارہ تھا جس کی نگارشات کو اس بارگاہِ قلندری میں شرفِ قبول حاصل ہوا اور پھر ۲۱ اپریل کو ہم ہمیشہ کے لئے اس دانائے راز کی طبیعی رفاقت اور سرپرستی سے محروم ہو گئے۔ یہ حادثہ اس قدر دلدوز و جگر سوز تھا کہ طلوعِ اسلام نے "نالۂ یتیم" کے عنوان سے جو ضمیمہ شائع کیا اس میں لکھا۔

> اس قیامت خیز حادثۂ جانکاہ کی جگر گدازی اس بچے سے پوچھئے جو آنکھ کھولتے ہی یتیم ہو جائے۔ ہم کشمکشِ حیات کی اس بھیانک وادی میں اس بھروسہ پر گامزن ہوئے تھے کہ اگر ہمارے پاؤں میں ذرہ سی بھی لغزش آئی تو ایک انگلی پکڑ کر اٹھانے والا ساتھ موجود ہے۔ لیکن مشیت کے فیصلے سے پہلے ہی قدم پر یہ آسرا ہم سے چھین لیا گیا۔ اور ہمارے مسرت کے قہقہے خون کے آنسوؤں میں بدل گئے .....
>
> پیامِ اقبالؒ کی شمعِ نورانی "طلوعِ اسلام" کے لئے خضرِ راہ ہوگی اور اس کی تابندگی و درخشندگی سے باطل کی ہر تاریکی کو مٹانا اس کا مقصدِ حیات ہوگا۔ واللہ المستعان۔
>
> (دہلی ۲۱ - اپریل سنہ ۱۹۳۸ء)

اقبالؒ کی طبیعی مفارقت کے سانحہ کو ۲۶ سال گزر گئے۔ لیکن اس کی بصیرتِ قرآنی اس طویل اور کٹھن سفر

میں قدم قدم پر ہماری رہنمائی کے لئے نشانِ منزل کا کام دیتی رہی۔ اس مدت میں بڑے اہم انقلابات برپا ہوئے۔ یہ انقلابات رفتہ رفتہ اس عظیم تحریک کے نشانِ راہ بنتے گئے جو بالآخر پاکستان کی جداگانہ مملکت کی تشکیل پر منتج ہوئی۔ اور کون نہیں جانتا کہ ہماری آزادی و استقلال کی یہ منزل بھی اسی

تصورِ اقبالؒ

مردِ قلندر کی قرآنی بصیرت کا شاہکار تھی۔ یہ اقبالؒ ہی نے بتایا تھا کہ جمہوریت کا مغربی تصور اس برصغیر کے مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی ابدی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دے گا اور اس سے ان کی حیاتِ ملی میں وہ حادثۂ قیامت رونما ہوگا جس سے بچاؤ کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اسی احساسِ زیاں کی پکار تھی جو مسلمانوں کے حقِ خود ارادیت کے مظاہروں اور جداگانہ مملکت کے قیام کے مطالبہ کی صورت میں دنیا کے سامنے آئی اور یہی نصب العین تھا جو سنہ ۱۹۳۰ء میں اقبالؒ نے اپنے خطبۂ صدارت میں ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لئے تجویز کیا۔ دس سال بعد پوری امت اس نصب العین کو اپنی جدوجہد کا مرکز و محور قرار دے چکی تھی۔ قائداعظم کی قیادت میں سات سال کی مختصر سی مدت میں اس نے جداگانہ مملکت کے قیام سے دنیا کے نقشوں کو بدل کر رکھ دیا۔ اور تاریخ ایک نیا موڑ مڑنے پر مجبور ہوگئی۔

پاکستان کے محسوس و مشہود پیکر میں اقبالؒ کے فکر و بصیرت نے جس مملکت کو جنم دیا وہ محض جغرافیائی حدبندیوں کی آئینہ دار نہیں بلکہ وہ مظہر ہے اس انقلاب آفریں تصورِ حیات (IDEALOGY) کی جسے خدا کا دین، تشکیلِ ملت کے لئے وجۂ اشتراک اور اساس قرار دیتا ہے۔ ایک طرف شیخ الہند کا نعرہ تھا کہ قوم وطن کی بنا پر تشکیل پاتی ہے اور دوسری طرف کروڑوں انسانوں کے قلب و نگاہ میں حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی اس نشیدِ قرآنی سے ایک نیا انقلاب ابھر رہا تھا کہ وحدتِ ملت کی بنیاد ایمان ہے۔ اشتراکِ وطن و نسل نہیں۔ اس انقلاب نے صدیوں کے بعد نوعِ انسانی کو ایک بار پھر اس حقیقت سے روشناس کرایا کہ نظریاتی اساس پر کیونکر ایک مملکت وجود پذیر ہوتی ہے۔ صدیوں قبل حضور رسالتمآبؐ کے مقدس ہاتھوں اسلامی مملکت کا وجود عمل میں آیا اور سنہ ۱۹۴۷ء میں تاریخ پھر بصد انداز یکتائی اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔

مملکتِ خداداد پاکستان کا وجود اقبالؒ کی اسی بصیرتِ قرآنی کا رہینِ منت ہے۔ اس مملکت کے عظمت و جلال کے لہراتے ہوئے پھریرے اقبالؒ کی اسی بلند نگہی اور مومنانہ فراست کو خراجِ تحسین پیش کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اور اس انقلاب آفریں حقیقت کی شہادت بہم پہنچا رہے ہیں کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت بھی موجود ہے جو انسانوں کے خودساختہ قوانین کے بجائے اپنے ہاں دینِ خداوندی کی عطا فرمودہ

مستقل اقدارِ حیات کو قانون سازی کی اساس قرار دینے کے ایمان دا اعلان کی بنا پر وجود میں آئی ہے۔ یہ سب کچھ اس حکیم انقلاب کے فکر و بصیرت کا جیتا جاگتا شاہکار ہے اور عصرِ حاضر کی تاریخ میں اپنی مثال آپ۔

اسلامی مملکت کے واضح نشانات

اقبالؒ نے محض اس مملکت کے حصول کی نشان دہی نہیں کی بلکہ تشکیل مملکت کے لئے ان اصول واقدار کا بھی شرح دیا جو قرنِ اوّل میں مملکت دین کی اساس بنے تھے۔ دیکھئے جاویدنامہ میں "مرغدین" کے عنوان سے وہ اس مملکت کا تصور اور خدوخال کس حسین انداز سے پیش کرتے ہیں جس میں قرآن کا مثالی معاشرہ برگ و بار لاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش — خوب رو و نرم خو و سادہ پوش
فکرشاں بے درد و سوزِ اکتساب — رازدانِ کیمیائے آفتاب
کس ز دینار و درم آگاہ نیست — ایں بتاں را در حرمہا راہ نیست
محنت کش دہقاں چراغش روشن است — از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاعِ آبجوست — حاصلش بے شرکتِ غیرے از دست
اندراں عالم ز لشکر نے قشون! — نے کسے روزی خورد از کشت و خون
نے ببازاراں ز بیکاراں خروش — نے صدائے گدایاں دردِ گوش

کس در ینجا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست!

پھر وہ حکیم مریخ کی زبانی اس حقیقت کی نقاب کشائی فرماتے ہیں کہ معاشرے کی تمام ناہمواریاں اور فساد انگیزیاں اس بنا پر ہیں کہ چند انسان دولت و رزق کے سرچشموں پر اپنی اجارہ داری اور ملکیت قائم کر لیتے ہیں جس سے کروڑوں افرادِ معاشرہ ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہاں ہر شے خدا کی ملکیت ہے اور بطور امانت انسانوں کے سپرد کی جاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

ملکیت نہیں امانت

اے کہ میگوئی متاعِ ما ز ماست — مرد ناداں ایں ہمہ ملک خداست
ارض حق را ارض حق دانی بگو — چیست شرحِ آیۂ لا تفسدوا
کس امانت را بکار خود نبرد — اے خوش آں کو ملک حق با حق سپرد
ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ — تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ

زیر گردوں فقر و مسکینی چراست آنکہ از مولاست می گوئی زماست

معاشی مسئلہ ایک مملکت کے نظام میں اہم ترین حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی دوررس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ مملکتِ پاکستان کو پوری شدت سے اس مسئلہ کے حل کی ضرورت درپیش ہوگی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے ۲۸ جولائی ۱۹۳۷ء کو قائدِاعظم کے نام ایک اہم خط لکھا اور اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضر کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما (DEVELOPMENT) دی جاسکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامان پرورش (SUBSISTENCE) ضرور مل جاتا ہے۔ (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں) اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (SOCIAL DEMOCRACY) کو اپنے ہاں قبول کرلیا تو ہندومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کرلینا کہ یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہوگا۔ بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا وہ شروع میں تھا۔

حضرت علامہ مرحوم کے نزدیک مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے قیام سے مقصود یہ تھا کہ اس خطۂ زمین میں قرآنی اصول و اقدار کی روشنی میں وہ معاشرہ متشکل ہو جس کے نشوونما ارتقائے شرف انسانیت کا محسوس نقشہ دنیا کے سامنے ابھر اور نکھر کر آجائے اور اس کے برگ و بار یہ ثابت کردیں کہ نوعِ انسانی کو اپنی حقیقی ربوبیت کا سامان اگر کہیں سے مل سکتا ہے تو اسی بارگاہ سے۔ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ایک خط کے جواب میں وہ اس نظام کی عالم آرا اور انسانیت ساز خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ۔

ارتقائے شرف انسانیت

اگر عالم بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن، سلامتی اور اس کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے اور کوئی اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ

عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نظر کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔

ڈاکٹر نکلسن کے نام خط میں وہ اسلامی نظام کی خصوصیات کی مزید وضاحت فرماتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ـ

اسلام بلکہ کائناتِ انسانیہ کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلاء کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسانی کی حیثیت سے انہیں یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سلسلۂ بنی آدم کی نشو و ارتقاء ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے الٰہ آباد سیشن (۱۹۳۰ء) میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کی تجویز پیش کرتے ہوئے انہوں نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا اس میں اسلام کے پیش کردہ اجتماعی نظام کا امتیازی پہلو منظرِ عام پر لاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقدِ اجتماعی کا پابند ہو۔ اسلامی ریاست کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں۔ بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔

اور اسلام کے اس اجتماعی نظام کی متمیز حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے نام اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں۔

اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت سے کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ

اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور جو غیر اسلامی ہو، نامقبول و مردود ہے۔

حکیم الامت نے احمدیت اور ختم نبوت سے متعلق پنڈت جواہر لعل نہرو کو جو تاریخی خط لکھا تھا اس میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کے مطالبہ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے تحریر فرمایا تھا کہ

منزہ اسلام کی خاطر

میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی مملکت کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا۔ اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک قائم ہیں اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت و تعلیمات پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

علامہ مرحوم نے اس حقیقت پر زور دیا کہ اسلام کی روحِ اجتہاد کو از سرِ نو زندہ کرنا اشد ضروری ہے تاکہ حالات کے بدلے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر جزئیاتِ دین کی از سرِ نو ترتیب عمل میں لائی جائے۔ چنانچہ ۱۷ ستمبر سنہ ۱۹۲۵ء کو صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام اپنے ایک مکتوب میں انہوں نے لکھا تھا کہ

اجتہاد

میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نکتہ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کر دے گا وہی اسلام کا مجدد ہو گا۔ اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا۔ قریباً تمام ممالک میں مسلمان اس وقت یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ (سوائے ایران و افغانستان کے)۔ ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانے کے میلانِ طبع سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ... غرضیکہ یہ وقت عمل کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شاید اسلام کی تاریخ میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

اسلامی نظام نوعِ انسانی کو جس شرف سے نوازتا ہے اس کی وضاحت علامہ مرحوم نے اپنے اس تاریخی خط میں کی تھی جو "قومیت اور وطنیت" کے موضوع پر بحث کے دوران انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کو لکھا تھا۔ اس مکتوب میں انہوں نے فرمایا تھا کہ

انسان کی تاریخ پر نگاہ ڈالو۔ ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ باہمی آویزشوں، خونریزیوں اور

خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالم بشری میں ایک ایسی اُمت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر مؤسس ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسب منشاء الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پا جائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہیں بلکہ یہ رحمۃٌ للعالمین کی ایک شان ہے کہ اقوام بشری کو ان کے تمام خود ساختہ تفوقوں اور فضیلتوں سے پاک کر کے ایک ایسی امت کی تخلیق کی جائے جس کو امۃ مسلمۃ لک کہہ سکیں۔ اور اس کے فکر و عمل پر شہداء علی الناس کا خدائی ارشاد صادق آسکے۔

یہ ہیں اس شمع بصیرت قرآنی کی ضوفشانیوں کے چند مختصر سے گوشے جو اس حکیم انقلاب نے شبستان ملت میں روشن کی۔ یہ وہ گہرہائے آبدار ہیں جن سے اس نے دامنِ ملت کو مالا مال کر دیا۔ یہ وہ متاعِ بے نظیر تھی جو اس کے قافلے میں لٹتی اور اسے سعد بختیوں سے ہمکنار کرتی گئی۔ سطح بین نگاہوں نے اسے محض شاعری سمجھا۔ لیکن یہ شاعری نہیں تھی بلکہ خدا کی زندہ جاوید کتاب کی وہ دعوتِ انقلاب تھی جس نے صدیوں کی غلام اور خود رفتہ ملت کو احساسِ خودی سے حیاتِ نو کا ذوق و شوق عطا کیا۔ یہ مایوس اور شکست خوردہ قوم اس بانگِ رحیل سے ایک نیا ذوقِ سفر لے کر اٹھی اور نشأۃ ثانیہ کی اُمنگیں اور عزائم سینے میں لئے آزادی اور استقلال کی حقیقی منزل پر جادہ پیما ہو گئی۔ اس کی منزل اقوام عالم میں سب سے انوکھی منزل تھی اور اس کا ذوقِ سفر امتیازی خصوصیت کا حامل۔

مقصد نہیں بلکہ ذریعہ

چند سالوں میں یہ کاروانِ شوق اپنی منزل تک پہنچ گیا۔ لیکن یہ منزل آخری منزل نہیں تھی۔ منتہیٰ و مقصود ایک خطۂ زمین کا حصول نہیں تھا بلکہ اقبالؒ کے اپنے الفاظ میں مقصود یہ تھا کہ وہ

> ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔

"نورِ توحید کا اتمام" ابھی باقی ہے اور جب تک یہ ممکن نہ ہو اقبالؒ کی روح مطمئن اور مسرور نہیں ہو گی۔

اس مقام پر اس حقیقت کی وضاحت ضروری ہے کہ اقبالؒ مملکت پاکستان کی وساطت سے جس "نورِ توحید کا اتمام" چاہتا تھا۔ اس خطۂ پاک میں جس ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کی تشکیل اس کا منشاء

مقصود تھی کیا وہ عقائد و نظریات کے اسی مرکب اور رسوم و رواج کے اسی مجموعے کے مرادف تھی جسے ہمارا "مُلّا" "اسلام" اور "خدا کا دین" کہہ کر اپنے سینے سے لگائے بیٹھا ہے۔ اور صدیوں سے اس نے اس پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے؟ کیا اسی دینِ مُلّا کی عملی تشکیل کے لئے اقبالؒ نے برصغیر میں مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی آرزوئیں کی تھیں؟ کیا عجمی تصورات کا یہی وہ جہالت آمیز

اقبالؒ کے تصور کا اسلام

مرکب تھا جسے ایک دستورِ حیات کے طور پر پانے کے لئے حصولِ پاکستان کی عظیم جنگ لڑی گئی تھی؟ کیا یہی وہ صدیوں کا خود ساختہ مذہب ہے جسے قبول نہ کرنے کے جرم میں پہلے ہی دن سے "قائد اعظمؒ" اور ان کے رفقاء کو یہ کہہ کر مطعون کیا جاتا تھا کہ "یہ مغرب پرست" لوگ جو خود اسلام کے باغی ہیں کبھی شرعی نظام کا نفاذ یہاں گوارا نہیں کریں گے؟ یہ اہم سوالات ان جذباتی ہنگامہ آرائیوں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں جو ہمارے ہاں کے مذہبی اجارہ داروں نے یہاں شروع سے اسلام، دین، خدا اور رسول کے مقدس نام پر برپا کر رکھی ہیں اور ان کی حقیقت کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھنے کے لئے انتہائی سنجیدگی سے غور و فکر کی ضرورت ہے۔

تحریکِ پاکستان کی مخالفت

اس سلسلے میں یہ امر واقعہ پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ قیامِ پاکستان کی مخالفت میں جو گروہ مقدمۃ الجیش بن کر پیش پیش رہا وہ خود ہمارے مذہبی پیشواؤں کا یہی گروہ تھا جو آج یہاں اسلام کے نام پر ہنگامہ بپا کر کے نظامِ مملکت پر تسلط جمانے اور اپنی اجارہ داری قائم کرنے کا مدعی ہے۔ آخر کیوں؟ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اسی گروہ کے سرخیل تھے جو تصورِ پاکستان کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئے تھے۔ اور اس کے لئے انہوں نے دینِ خداوندی کی وہ مضحکہ خیز تاویلات پیش کیں کہ علامہ اقبالؒ کو اپنے آخری بیان میں خون کے آنسو بہاتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ

> عصرِ حاضر کے ہندوستانی علماء کو حالاتِ زمانہ نے وہ باتیں کرنے اور دین کی ایسی تاویلیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے جو قرآن یا نبیؐ امیؐ کا منشا ہرگز نہ ہو سکتی تھیں۔

اقبالؒ کے پیش کردہ تصورِ پاکستان کی ان "مقدسین" کی بارگاہ سے یہ انتہائی شدید مخالفت اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ پاکستان میں جس دینِ خداوندی کو متشکل کرنا مقصود تھا وہ کم از کم مُلّا کا وہ دین نہیں تھا جسے ہمارے ہاں اسلام کے نام پر پیش کیا جاتا ہے اور دن رات منبر و محراب سے اس کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک اگر مُلّا اور اس کے خود ساختہ مذہب کی ذرا سی اہمیت بھی ہوتی تو وہ ساری زندگی مُلّا اور مذہبِ مُلّا کے خلاف جہاد روا نہ رکھتے۔ ان کی تحریریں

مُلّا کے خلاف اس قدر غیظ و غضب سے بھرپور نہ ہوتیں۔ اقبالؒ کو مُلّا کی ذات سے کوئی ذاتی کد نہیں تھی۔

اقبال اور مُلّا کا اسلام

مُلّا ان کے نزدیک ایک مخصوص ذہنیت کا نام تھا جس نے خدا کے مقدس دین کی عزت و ناموس کو تباہ کیا اور امت کو اس کے عالم گیر اور عالم آرا مقام و منصب سے بے نصیب کر کے رکھ دیا۔ دیکھئے وہ مُلّا اور دینِ مُلّا کے خلاف کس جوش و خروش اور غیظ و غضب سے رزم آراء کھائی دے رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم　　　قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر　　　کہ دل در سینۂ مُلّا گدازیم

مُلّا کی جہالت کا ماتم کرتے ہوئے وہ پکار اٹھتے ہیں کہ

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را　　　بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند　　　کہ مُلّا کم شناسد رمزِ دیں را

دینِ مُلّا کی فساد انگیزیوں سے خبردار کرتے ہوئے اس نے کہا کہ

دیں کافر فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

اس نے مکتبِ ملا کی حقیقت بھی کھول کر رکھ دی اور اس کی تعلیمات کی بھی، جب اس نے کہا کہ

مکتب و ملّا و اسرارِ کتاب
کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

اور یہ بھی کہ

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اپنے مخصوص قلندرانہ انداز میں وہ ملّاؤں کے سرخیل سے اپنے تقابل کے سلسلے میں یوں نعرہ بلند کرتا ہے کہ

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

مذہبِ مُلّا کی جمود انگیزیوں پر اس کی گہری طنز کو سامنے لائیے!

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل　　　یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدامست　　　یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

اور تو اور۔ اقبالؒ کو یہ تک گوارا نہیں کہ مُلا کو جنت کا کوئی گوشہ نصیب ہو کیونکہ اسے خطرہ ہے کہ اس کی فتنہ انگیز ذہنیت وہاں بھی جہنم کے شعلے برپا کر دیگی۔ سنئے اس کے اپنے الفاظ میں جب وہ کہتا ہے کہ

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ مُلا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی میری تقصیر معاف
خوش نہ آئینگے اسے حور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقوال!
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

وہ مُلا کو یوں مخاطب کرتا ہے ؎

ترا با خرقہ و عمامہ کارے   من از خود یافتم بوئے نگارے
ہمیں یک چوب من سرمایۂ من   نہ چوبِ منبرے نے چوبِ دارے

اس نے مُلا کے قلب و نگاہ کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ

دلِ مُلا گرفتارِ غمے نیست   نگاہش ہست و در چشمش نمے نیست
از آں بگریختم از مکتبِ او   کہ در ریگِ حجازش زمزمے نیست

مُلا کی خطابت کی زہر چکانیوں پر اُسے یوں آنسو بہانے پڑے کہ

سرِ منبر کلامش نیش دار است   کہ او را صد کتاب اندر کنار است
حضورِ تو من از خجلت نگفتم   ز خود پنہاں و بر ما آشکار است

مُلا کے ہاتھوں حرم کے بجائے جس دیر کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس سے خبردار کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا کہ

نگہبانِ حرم معمارِ دیر است   یقینش مردہ و چشمش بہ غیر است
ز اندازِ نگاہِ او تواں دید   کہ نومید از ہمہ اسبابِ خیر است

مذہب کے اس خود ساختہ اجارہ دار نے جبّہ و دستار کی آڑ میں کافرگری کے شعلوں سے دینِ خداوندی کے لئے جو رسوائیاں پیدا کیں ان پر خون کے گھونٹ پیتے ہوئے اقبالؒ کو کہنا پڑا کہ

دینِ حق از کافری رسوا تر است   زانکہ مُلا مومنِ کافر گر است
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد   ملت از قال و اقولش فرد فرد

اُسے مُلا کی اذان اور صلوٰۃ سے بھی مایوسی کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوا اور اسی فرطِ یاس میں اس نے مُلا کو

مخاطب کرتے ہوئے یہ فریاد کی کہ

تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام!

الغرض اقبالؒ کے نزدیک ملّا نام ہے اس ذہنیت کا جو زندہ قوموں کے لئے مدفن تیار کرتی ہے یعنی ع

ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

اور پھر کرگس کی طرح مردہ قوموں کی لاشوں کو نوچتی چلی جاتی ہے۔ وہ ملّا اور مجاہد کے تقابل کے سلسلے میں بتاتا ہے کہ

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

یہ ہیں ملّا اور اس کے مذہب کے بارے میں اس حکیم الامت کے تاثرات و تصورات جس نے اسلام کو ایک زندہ اور عالم آرا نظام کی حیثیت سے متشکل کرنے کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی آواز بلند کی۔ اور ملّاؤں کے گروہ نے اس کے خلاف منظم شور و شر بپا کیا۔ یہی امر واقعہ پکار پکار کر اس حقیقت کی شہادت دے رہا ہے کہ ایک نظام مملکت کی حیثیت سے اقبال جس اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا داعی تھا وہ ملّا کا وہ مذہب ہرگز نہیں تھا جس کی اجارہ داری اس نے صدیوں سے کروڑوں مسلمانوں کے دل و دماغ پر برفانی سِلوں کی طرح مسلط کر رکھی تھی۔ کیونکہ جہاں تک

ہے دینِ ملّا

مذہب ملّا کی کارفرمائی کا تعلق ہے اس کے لئے تو الگ خطۂ زمین اور جداگانہ مملکت کی ضرورت ہی نہیں تھی — ہمارے امام الہند اور شیخ الہند کی طرف سے اس تصور اور تحریک کی کھلی مخالفت اسی حقیقت کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے — وہ یہ چاہتے ہی نہیں تھے کہ مسلمانوں کو اپنی جداگانہ اسلامی مملکت کے قیام میں کامیابی نصیب ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ ملّا کے پیش کردہ مذہب کو اسلام اور خدا کا وہ دین سمجھتے ہی نہیں تھے جو اپنی اصلی اور منزہ شکل میں حضور نبی اکرمؐ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں نفاذ پذیر ہوا تھا۔ ان کے نزدیک ملّا کا یہ مذہب جو صدیوں سے ہمارے ہاں اسلام بن کر رائج ہے، عرب ملوکیت (خلافت بنی امیہ و عباسیہ) کے دور میں رائج ہوا اور بتدریج اس نے حقیقی اسلام کی جگہ لے لی۔

یہی وجہ تھی کہ جب علامہ موصوف نے سنہ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت میں جداگانہ اسلامی مملکت کی تجویز پیش کی تو اس میں بالخصوص یہ ارشاد فرمایا کہ

ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی مملکت کے متعلق میرا یہ مطالبہ ہندوستان اور مسلمانانِ ہند دونوں کے بہترین مفاد پر مبنی ہے۔ اس سے چونکہ اندرونی طاقتوں میں توازن پیدا ہو جائے گا اس لئے ملک میں امن و امان قائم ہو جائے گا۔ یہ تو ہندوستان کا فائدہ ہو گا اور اسلام کو موقع ملے گا کہ اس پر عربی ملوکیت سے جو غیر اسلامی اثرات غالب آ چکے ہیں ان سے مخلصی حاصل کرے اور اپنے شرعی قوانین، اپنی تعلیم، اور اپنے کلچر کی تنظیم کر کے انہیں اپنی اصلی روح اور عصر حاضر کی ضروریات سے قریب تر لا سکے۔

دورِ ملوکیت کا اسلام

ان الفاظ پر غور کیجئے۔ ایک ایک لفظ بتا رہا ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک اس مملکت کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہاں اسلام کو عربی ملوکیت کے غیر اسلامی تصورات سے نجات دلا کر اس کی حقیقی روح کو عصر حاضر کی ضروریات کے مطابق نظامِ مملکت کی صورت میں متشکل کیا جائے۔ یہ اسلام جس کا محافظ ملا چلا آ رہا ہے اور جسے وہ اب پاکستان میں نافذ کرنا چاہتا ہے۔ وہی ہے جو عباسیوں کے دورِ حکومت میں عجمی اثرات کے ماتحت وضع ہوا۔ یہی وہ اسلام تھا جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اقبالؒ نے مملکتِ پاکستان کی تشکیل کی تجویز پیش کی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ ملا کا پیش کردہ اور مسلمانوں میں مروجہ مذہب یہ صلاحیت ہی نہیں رکھتا کہ ہماری کسی ایک مشکل کا حل بھی پیش کر سکے۔ مثال کے طور پر دیکھئے یہ مذہب سعودی عرب میں شریعتِ اسلامی کے نام سے نافذ ہے۔ اس کے نتائج کیا ہیں اس کا اندازہ وہاں کے عوام کی حالت سے لگایا جا سکتا ہے۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اس میں بھی یہی کشمکش جاری ہے۔ یہاں وہ لوگ موجود ہیں جو دل سے چاہتے ہیں کہ یہاں اسلام ایک عملی نظامِ حیات کی شکل میں نافذ ہو۔ لیکن چونکہ یہ اسلام، ملا کے تصور کے اسلام کے خلاف ہے اس لئے اس کی طرف سے اس کی اسی طرح (بلکہ اس سے بھی شدید تر) مخالفت ہوئی جتنی مخالفت الحاد اور بے دینی کی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آج اقبالؒ اور قائداعظمؒ بھی زندہ ہوتے تو ملا ان کے پیش کردہ اسلام کی بھی اسی طرح مخالفت کرتا۔ لہٰذا یہاں کا اصلی مسئلہ یہ ہے (اور یہ مسئلہ یہیں کا نہیں۔ سارے عالمِ اسلام کا ہے) کہ جب تک اس اسلام سے پیچھا نہیں چھڑایا جائے گا جسے ملا کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے، نہ ہم صحیح اسلامی زندگی اختیار کر سکیں گے اور نہ ہی ہمارا شمار دنیا کی زندہ قوموں میں ہو سکے گا۔ ہم بہ وثوق کہہ سکتے ہیں کہ ایسا کہنے

میں ہم پاکستان کے بے شمار قلوب کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہم یہ باتیں سرِ محفل کرتے ہیں اور یہ حضرات ہنوز اپنے خیالات کو خلوت تک محدود رکھتے ہیں۔ اب یہاں دو ہی صورتیں نظر آتی ہیں۔ اگر ان حضرات نے جرأت سے کام لیا اور اس کا اعلان اور تہیہ کر لیا کہ پاکستان میں اس اسلام کا احیاء ہو گا جو (اقبال کے الفاظ میں) "عربی ملوکیت" سے پاک ہو گا تو ہم اقبالؒ کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کر سکیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو جو حشر اور ملّازدہ قوموں کا ہوتا ہے، وہی ہمارا ہو گا۔ فطرت کی ٹھوس حقیقتیں، مقدس آرزوؤں سے مٹ تھوڑا جاتی ہیں! اقبالؒ نے اسی لئے تو کہا تھا کہ —— حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

مُفکّرِ قرآن کی سالہا سال کی مسلسل کاوشِ فکر و بصیرت کا شاہکار

مفہوم القرآن

قرآنی حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے کا یہ دل نشیں اور بصیرت افروز سلسلہ پاکستان اور بیرونِ پاکستان کے علمی حلقوں میں برابر مرکزِ توجہ بنتا جا رہا ہے۔ خدا کی آخری کتاب کے عالم آرا پیغام کو سمجھنے کے لئے اس سے پوری طرح استفادہ کیجئے۔

اسے ایک ایک پارہ کر کے شائع کیا جا رہا ہے اور اب تک ۱۸ پارے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے دس پارے یکجا طور پر مجلد بھی ملتے ہیں۔

پہلا پارہ۔ ۳ روپے —— (سستا ایڈیشن۔ ایک روپیہ)۔

ہر دوسرا پارہ —— ۲ روپے فی پارہ —— دس پارے مجلد —— ۲۳ روپے۔

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور سے بھی مل سکتی ہے۔

پٹسن کی مصنوعات تیار کرنے والوں میں

★ ایک ممتاز اور نمایاں مقام کے حامل ★

لطیف باوانی جوٹ ملز لمیٹڈ

ڈھاکہ

اس ادارہ کے تیار کردہ تھیلے۔ بوریاں۔ سوتلیاں اور ٹاٹ کی دیگر اشیاء دنیا کے مختلف گوشوں میں بھیجے جاتے ہیں اور دنیا کے ہر حصے میں ویسے ہی مقبول عام ہیں جیسے اپنے گھر میں۔

مینیجنگ ایجنٹس

احمد برادرز لمیٹڈ ۳۵-۳۶ جناح ایونیو۔ رمنا۔ ڈھاکہ

تار کا پتہ: "باوانی" — فون نمبر ۲— ۶۷۳۱

کراچی آفس: بینک ہاؤس حبیب اسکوائر بندر روڈ کراچی

مجلس اقبالؒ

مثنوی ۔ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق!

باب ۔ سیاست حاضرہ

سابقہ باب میں حضرت علامہؒ نے (تقسیم سے قبل) اہل ہند سے بالعموم اور مسلمانوں سے بالخصوص کہا تھا کہ ان کے باہمی تشتت و افتراق نے ان کی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط سے مضبوط تر بنا رکھا ہے۔ انہیں چاہیئے کہ غیروں کی غلامی سے نجات حاصل کرکے صحیح آزادی کی زندگی بسر کریں۔ اور صحیح آزادی ضبط خویش کے بغیر میسر نہیں آسکتی۔

زیر نظر باب میں وہ بتاتے ہیں کہ عصر حاضر کی (مغربی) سیاست کیا ہے اور انسانیت کے حق میں اس کے اثرات و نتائج کیا! سیاست حاضرہ کیا ہے؟ جو کچھ انسان اپنے عہد جہالت میں کھلے بندوں کرتا تھا اسے تہذیب و تمدن کے "نگاہ فریب نقاب" میں کرنا۔ بالادست انسانوں کا، زیر دستوں کو اپنی محکومی اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھنا لیکن اس انداز سے کہ وہ "قفس کو آشیاں" سمجھنے لگیں۔ اس سیاست کی کیفیت یہ ہے کہ

می کند بند غلاماں سخت تر حریت می خواند او را بے بصر

یہ محکوم قوموں کی غلامی کی زنجیروں کو سخت سے سخت تر کرتی رہتی ہے۔ صحیح آزادی کے معیار کے مطابق، یہ سیاست یکسر اندھی اور بے بصر ہے۔ لیکن فریب دہی میں اسے کمال حاصل ہے چنانچہ

گرمیٔ ہنگامۂ جمہور دید پردہ بر روئے ملوکیت کشید

جب اس نے دیکھا کہ عوام میں سیاسی شعور بیدار ہو رہا ہے تو اس نے ملوکیت کے چہرے پر جمہوریت

(DEMOCRACY) کا نقاب اوڑھا کر عوام کو خوش کر دیا کہ اب بادشاہوں کے استبداد کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب عوام کی اپنی حکومت کا دور آگیا ہے۔ حالانکہ

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

ملوکیت میں عوام پر ایک فرد حکومت کرتا تھا۔ جمہوریت میں ایک پارٹی حکومت کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوال حکومت کی شکل (FORM OF GOVERNMENT) کا نہیں۔ سوال انسانوں کا انسانوں پر حکومت کرنے کا ہے۔ اگر ایک انسان یا انسانوں کی جماعت کو حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے، تو حکومت کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو، انسانوں کو حقیقی آزادی حاصل ہو نہیں سکتی۔ یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہ ہو۔ حکومت کا کام صرف اس قدر ہو کہ وہ ان مستقل اقدار کو نافذ کرے جنہیں خدا نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے متعین کیا ہے۔ اور یہ صورت صرف اس ہئیتِ اجتماعیہ کی رو سے پیدا ہو سکتی ہے جسے قرآن کریم نے تجویز کیا ہے۔ اسی کا نام "دین و سیاست" کا امتزاج ہے۔ اگر یہ امتزاج نہ ہو تو استبداد اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ صرف اس کے پیکر بدلتے رہتے ہیں۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس کے بعد سیاستِ حاضرہ کی سب سے بڑی لعنت نیشنلزم ہے۔ قرآن کریم نے یہ بتایا تھا کہ انسانوں کی تقسیم، آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ہونی چاہیئے۔ یعنی دنیا کے جس قدر انسان ایک نصب العینِ حیات رکھیں وہ ایک قوم کے افراد جن کا نصب العین ان سے مختلف ہو وہ دوسری قوم کے افراد۔ لیکن نیشنلزم نے کہا نہیں! یہ تقسیم غلط ہے۔ ایک سلطنت کے اندر بسنے والے تمام انسان — خواہ وہ فکر و نظر کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، سب ایک قوم کے افراد ہوں گے۔ اور انہی اقوام کے نمائندگان پر مشتمل ایک جمعیت الاقوام (U.N.O.) ہو گی۔ اس سے اس سیاست نے اپنے پیشِ نظر مقصد — یعنی کمزوروں اور ضعیفوں پر تغلب و تسلط — کو تو حاصل کر لیا لیکن اصول ایسا غلط وضع کیا جس سے انسانیت تباہ ہو گئی۔

در فضایش بال و پر نتواں کشود — با کلیدش ہیچ در نتواں کشود

ایسی سیاست جس کا مطمحِ نگاہ ہی کمزوروں کا گلا گھونٹنا ہو۔ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ اس کی فضا میں کسی کو آزادی کا سانس لینا نصیب ہو سکے۔ یہ ناممکن ہے۔ نہ ہی اس سے انسانی مشکلات کا کوئی حل مل سکتا ہے۔ اس کنجی سے دنیا کا کوئی تالا بھی نہیں کھل سکتا۔

گفت با مرغ قفس اہرمنے دود مند آشیاں در خانۂ صیاد بند
ہر کہ سازد آشیاں در دشت و مرغ او نباشد ایمن از شاہین و چرغ"

یہ سیاست ہمیشہ مرغِ قفس کو یہ سبق پڑھاتی رہتی ہے کہ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں گوشے میں قفس کے "مجھے" آرام بہت ہے

وہ محکوموں کے کان میں یہ افسوں پھونکتی رہتی ہے کہ غلامی کی زندگی آزادی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ تم آزاد ہو جاؤ گے تو اپنی مصیبتوں کا حل خود دریافت کرنا پڑے گا۔ کبھی داخلی پریشانیاں اور کبھی خارجی خطرات۔ یہ دردِ سر مول کیوں لیتے ہو۔ غلامی کی زندگی میں یہ تمام مصیبتیں دوسروں کے سر پر ہوتی ہیں۔ اور محکوم نہایت اطمینان کی نیند سوتا ہے۔

از فسونش مرغِ زیرک دانہ مست نالہ ہا اندر گلوئے خود شکست

اس سحر کارانہ تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہزار عقل و خرد کا مالک محکوم قفس کے آب و دانہ پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور غلامی کے خلاف اس کے احساسات .... مردہ ہو جاتے ہیں۔ وہ پھر ایک حرفِ شکایت بھی زبان تک نہیں لاتا۔

حریت خواہی بہ پیچاکش میفت تشنہ میر و بر نم تاکش میفت

لہٰذا اگر تم آزادی چاہتے ہو تو اس ابلیسانہ سیاست کے پھندے میں نہ پھنس جانا۔ تم پیاس سے مر جاؤ۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ تم اس کے دانۂ انگور سے اپنے حلقِ خشک کو تر کرو۔

الحذر از گرمیٔ گفتار او الحذر از حرفِ پہلو دار او

ان سیاست والوں کی باتیں بڑی ملمع کار اور پُر فریب ہوتی ہیں۔ ان میں صداقت اور خلوص نام کو نہیں ہوتا۔ منافقت اور فریب دہی کا نام ان کے ہاں ڈپلومیسی رکھا جاتا ہے۔

چشم ہا از سرمہ اش بے نور تر بندۂ مجبور از و مجبور تر

اس سیاست کے سرمہ نے دنیا کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ اس سے محکوم اور کمزور اور زیادہ محکوم اور کمزور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ حضرت علامہؒ نے بالِ جبریل میں کہا ہے۔

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن پرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے

یہاں انہوں نے اس آنکھ کو بے بصر و بے نور کہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس سیاست کے چشمے سے دیکھئے تو کوئی شے اپنی اصلی شکل اور رنگ میں دکھائی ہی نہیں دیتی۔ اس سیاست کے اصول (یا بے اصول پن) نگاہوں کا زاویہ بدل دیتے ہیں۔

از شراب ساتگینش الحذر   از قمار بدنشینش الحذر

اس سے جس قدر دور رہا جائے اچھا ہے۔

از خودی غافل نگردد مردِ حر   حفظِ خود کن حبِ افیونش مخور

مردِ آزاد کو ہمیشہ اپنی ذات کی نگہداشت کرنی چاہیئے۔ اور وہ اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اس سیاست پرفتن کی افیون سے پرہیز کیا جائے۔

پیش فرعوناں بگو حرفِ کلیم
تا کند ضربِ تو دریا را دو نیم!

سیاستِ حاضرہ انسان کو منافق بنا دیتی اور اسے مداہنت پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔ لیکن حفظِ ذات انسان کے دل میں جرأت اور مردانگی کے جوہر پیدا کر دیتی ہے۔ یہی وہ جوہر ہیں جن کی رو سے ایک مردِ مومن فرعون جیسے استبداد اور قہرمانی کے مجسمے کے سامنے بیباکانہ حق کی آواز بلند کرتا ہے اور اس جرأتِ ایمانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی ضرب سے دریا کا سینہ بھی شق ہو جاتا ہے یعنی اس کے سامنے بڑی سے بڑی مشکل بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

اس کے بعد علامہ مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں اور جیساکہ ان کا انداز تھا اپنے سینے کے داغوں کو با صد آہ و فغانِ نیم شبی، نمایاں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

داغم از رسوائی این کاروان   در امیر او ندیدم نورِ جان

کاروانِ ملت کی زبوں حالی اور خواری کو دیکھ کر میرا سینہ داغ داغ ہو جاتا ہے۔ ان کے لیڈروں میں مجھے وہ نور دکھائی نہیں دیتا جس سے انسان کی زندگی جگمگا اٹھتی ہے[۱]

تن پرست و جاہ مست و کم نگہ   اندرونش بے نصیب از لا الٰہ

یہ ہر وقت اپنے مفاد کی سوچتے ہیں۔ انگریز کے ہاں سے جاہ و منصب حاصل کرنا ان کی زندگی کا منتہیٰ ہے۔ اس قدر تنگ نظر واقع ہوئے ہیں کہ قوم کے مستقبل کے متعلق کبھی نہیں سوچتے۔ بظاہر یہ قوم کے بڑے خیر خواہ اور پکے مسلمان بنتے ہیں لیکن ان کے دل میں ایمان کی رمق نہیں۔

در حرم زاد و کلیسا را مرید   پردۂ ناموسِ ما را بر درید

---

[۱] یہ تھے وہ حالات جن کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے قائداعظم محمد علی جناحؒ کو دعوت دی تھی کہ اگر قوم کی کشتی کو سنبھالیئے اور انہوں نے اقبالؒ کے اعتماد کو سچ کر دکھایا۔

مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں اور انگریزوں کے مرید ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ملتِ اسلامیہ کی عزت اور آبرو کو خاک میں ملا دیا ہے۔

دامن او را گرفتن ابلہی است — سینۂ او از دلِ روشن تہی است

ایسے لیڈروں کے پیچھے چلنا حماقت ہے۔ ان کے سینے میں دل زندہ موجود ہی نہیں۔

اندریں رہ تکیہ بر خود کن کہ مرد — صید آہو با سگِ کورے نکرد

اندریں حالات تمہیں چاہیئے کہ ان لیڈروں پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنے آپ پر بھروسہ کرو۔ کبھی اندھے کتوں کے ساتھ ہرنوں کا شکار بھی ہو سکتا ہے؟ (یہ پنجابی زبان کے ایک محاورہ کا ترجمہ ہے)۔

آہ از قومے کہ چشم از خویش بست — دل بغیر اللہ داد، از خود گسست

کس قدر قابلِ تاسف ہے حالت اس قوم کی جس نے خود اپنے آپ کو فراموش کر دیا۔ اپنی امیدوں کا دامن غیر اللہ کے ساتھ باندھ لیا۔ اور یوں اپنے آپ کو کھو دیا۔

تا خودی در سینۂ ملت بمرد — کوہ کاہے کرد باد او را ببرد

جب قوم کے سینے میں خودی کا احساس ختم ہو گیا تو اس کی کیفیت ایک پرِ کاہ جیسی ہو گئی جسے ہوا کا ہر تیز جھونکا جدھر جی چاہے اڑائے اڑائے پھرے۔ اس کا اپنا مقام ہی کوئی نہ رہا۔

گرچہ دارد لا الٰہ اندر نہاد — از بطونِ او مسلمانے نزاد

مسلمان اس کا اعتراف اور اعلان کرتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ پر ان کا ایمان ہے۔ یعنی اس حقیقت پر ایمان کہ انسان، قوانینِ خداوندی کے علاوہ کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کر سکتا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس قدر بلند نظریۂ زندگی رکھنے والی امت کے اندر سے ایک بھی مسلمان ایسا پیدا نہیں ہوا جو اس نظریہ کی صداقت کو عملاً دنیا کے سامنے پیش کرتا۔

آنکہ بخشد بے یقیناں را یقیں — آنکہ لرزد از سجودِ او زمیں
آنکہ زیرِ تیغ گوید لا الٰہ! — آنکہ از خونش بروید لا الٰہ!
آں سرور و آں سوزِ مشتاقی نماند — در حرم صاحبدلے باقی نماند

ایسا مسلمان کہ جس کے ایمان کی قوت بے یقینوں کے دلوں میں یقینِ محکم پیدا کر دیتی۔ جس کے سجدے سے زمین لرز اٹھتی۔ جو تلوار کے نیچے سر رکھ کر بھی لا الٰہ کہے۔ جس کے خون سے لا الٰہ کا شجرِ طیب پیدا ہو۔ افسوس کہ امت میں ایسا کوئی مسلمان پیدا نہ ہوا۔ ان میں وہ سرور و سوز جس سے کائنات میں زندگی کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے باقی نہ رہا۔ حرم کعبہ میں ایک بھی ایسا مسلمان نہ رہا جو سینے میں

دھڑکنے والا دل رکھتا ہو۔

اے مسلماں! اندریں دیرِ کہن — تا کجا باشی بہ بندِ اہرمن

مسلمان اور اس کے گلے میں ابلیس کا پھندا! بالآخر اس انداز کی زندگی کب تک بسر کرو گے!!

جہد با توفیق و لذت در طلب — کس نیابد بے نیازِ نیم شب

لیکن اس قسم کی زندگی کے لئے جس میں جہادِ مسلسل اور سعیٔ پیہم معمولِ حیات ہو جائے اور اس طلب و کاوش میں انتہائی لذت محسوس ہو، اس صورت میں میسر آسکتی ہے کہ انسان راتوں کی تنہائیوں میں انتہائی غور و فکر سے کام لے۔ اور دل کے پورے گداز کے ساتھ احکامِ قرآنی پر عمل کرنے کا تہیہ کرے۔

زیستن تا کے بہ بحر اندر چو خس
سخت شو چوں کوہ از ضبطِ نفس

سمندر میں ایک تنکے کی طرح زندگی بسر کرنا کہ ہر موج اسے اپنے ساتھ بہا کر لے جائے، قابلِ فخر زندگی نہیں۔ انسان کو ضبطِ خویش سے پہاڑ کی طرح محکم ہونا چاہیئے کہ بڑے سے بڑا طوفان بھی اسے اس کے مقام سے نہ ہلا سکے۔

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی — مزی چو خس کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

اس کے بعد حضرت علامہؒ اپنے قلبِ پرسوز کی ایک ایسی کیفیت کو بیان کرتے ہیں۔ جس سے انسان کی روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کو انہوں نے اگرچہ ایسے انداز میں بیان کیا ہے گویا وہ ان کی ذاتی واردات ہے۔ لیکن یہ درحقیقت پوری کی پوری امت کی قلبی کیفیت کی ترجمان ہے۔ کہتے ہیں۔

گرچہ دانا حالِ دل با کس نگفت — از تو دردِ خویش نتوانم نہفت

اگرچہ عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنے دل کا ماجرا کسی سے نہ کہے — غمِ دل گفتنہ بہتر ہمہ کس جگر ندارند — لیکن میں تم سے اپنے دل کا غم چھپا نہیں سکتا۔

تا غلامم در غلامی زادہ ام — ز آستانِ کعبہ دور افتادہ ام

میں انسانوں کا محکوم ہوں۔ غلامی میں پیدا ہوا اور غلامی ہی میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔ کعبہ کہ جو ساری دنیا کے لئے آزادی کا مرکز بننے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا اس کے مقصود و مطلوب سے میں بہت دور ہٹ چکا ہوں۔ ایک محکوم و غلام کو کعبہ سے کیا نسبت؟

چوں بنامِ مصطفیٰ خوانم درود ۔۔۔ از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ اے محکومِ غیر ۔۔۔ سینۂ تو از بتاں مانند دیر
تا نداری از محمدؐ رنگ و بو
از درودِ خود میالا نامِ او

میں جب رسول اللہؐ سے اپنی نسبت جوڑتا ہوں اور حضورؐ پر درود و سلام بھیجتا ہوں تو شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ عشقِ رسولؐ مجھ سے کہتا ہے کہ اے وہ جو تو غلامی میں زندگی بسر کرتا ہے۔ تیرے دل میں ہزاروں بت چھپے ہوئے ہیں۔ تجھے حضورؐ پر درود بھیجتے شرم نہیں آتی؟ جب تو سیرتِ مصطفویؐ کا کوئی پرتو بھی اپنے اندر نہیں رکھتا تو اس دعوے سے حضورؐ کے اسمِ گرامی کو کیوں داغدار کرتا ہے۔ حضورؐ پر درود بھیجنے کا حق اسی کو حاصل ہے جس کی سیرت، اسوۂ حسنۂ نبی اکرمؐ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔

از قیامِ بے حضورِ من مپرس ۔۔۔ از سجودِ بے سرورِ من مپرس

میں خدا کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہوتا ہوں اور زبان پر "ایاک نعبد" کے الفاظ ہوتے ہیں۔ یعنی یہ اعلان کہ "میں تیرے سوا کسی اور کی محکومی اختیار نہیں کرتا" اور دل کہیں اور ہوتا ہے۔ میرا سر سجدہ میں ہوتا ہے لیکن یہ سجدہ محض رسمی ہوتا ہے۔ اس میں وہ کیفیت نہیں ہوتی جو ایک سچے مومن کے سجدہ میں ہوتی ہے۔

جلوۂ حق گرچہ باشد یک نفس ۔۔۔ قسمتِ مردانِ آزاد است و بس

محکوم کا سجدہ محض ایک رسم کی ادائیگی ہوتی ہے۔ جس سجدہ سے خدا کی صفات انسان کے سامنے بے نقاب ہو کر آ جاتی ہیں وہ تو صرف آزاد مردوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔

مردِ آزادے چو آید در سجود ۔۔۔ در طوافش گرم رو چرخِ کبود

جب کوئی مردِ آزاد سجدہ میں جاتا ہے تو آسمان اس مردِ مومن کا طواف کرنے لگ جاتا ہے۔

ما غلاماں از جلالش بے خبر ۔۔۔ از جمالِ لازوالش بے خبر

ہم غلام، نہ جلالِ خداوندی سے آگاہ ہو سکتے ہیں نہ اس کے جمال سے۔

از غلامے لذتِ ایماں مجو ۔۔۔ گرچہ باشد حافظِ قرآں مجو

غلام کے حصے میں ایمان کی لذت کیسے آ سکتی ہے۔ وہ اگر قرآن کا حافظ ہو تو بھی اس کیف سے بے نصیب رہتا ہے۔

مومن است و پیشۂ او آذری است ۔۔۔ دین و عرفانش سراپا کافری است

غلام قوم کے افراد، مومن کہلاتے ہیں لیکن بت گری اور بت فروشی ان کا پیشہ ہوتا ہے۔ ان کی شریعت

اور طریقت دونوں کفر کے مظاہر ہوتے ہیں۔

واضح رہے کہ علامہ اقبالؒ (اور قرآن) کے نزدیک، غلام اور آزاد میں یہ فرق نہیں کہ اگر کسی قوم پر کوئی غیر قوم حکومت کرتی ہے تو وہ قوم محکوم ہے اور اگر وہ اپنے ملک پر آپ حکمران ہے تو وہ آزاد ہے۔ قرآن کی رُو سے محکوم اور آزاد میں فرق یہ ہے کہ اگر کوئی قوم قوانینِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرتی ہے تو وہ آزاد ہے اور اگر انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا اتباع کرتی ہے تو محکوم ہے خواہ ان کی حکومت اپنی ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وہ حقیقت ہے، جس کے پیشِ نظر حضرت علامہؒ کہتے ہیں کہ

در بدن داری اگر سوزِ حیات ہست معراجِ مسلماں در صلوٰت

اگر دل میں ایمان کی حرارت ہے تو یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ صلوٰۃ مردِ مومن کو اس مقام پر پہنچا سکتی ہے جس تک دوسرے انسانوں کی نگاہ بھی نہیں پہنچ سکتی ــــ صلوٰۃ اس نظام کا نام ہے جس میں ہر فردِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے۔ اسی اتباعِ احکامِ قرآنی سے جماعتِ مومنین کو وہ سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہو سکتی ہیں جو اقوامِ عالم میں کسی اور کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔

در نداری خونِ گرم اندر بدن سجدۂ تو نیست جز رسم کہن

اور اگر سینہ حرارتِ ایمان سے خالی ہے تو پھر تیرا سجدہ ایک رسم کے سوا کچھ نہیں۔

عید آزاداں شکوہ و ملک و دیں
عید محکوماں ۔ ہجومِ مومنیں!

آزاد بندوں کی عید میں ملک اور دین کی شان و شوکت جھلکتی نظر آتی ہے اور محکوموں کی عید ــــ کمزوروں اور ناتوانوں کے ہجوم سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

یہ ہے آزادی کا تصور اور اس کی قدر و قیمت علامہ اقبالؒ کے نزدیک۔ جسے تنگ نظر، قدامت پرست، نیشنلسٹ حضرات "استعماریت انگریز کا ایجنٹ" کہا کرتے تھے۔ انسان بھی جوشِ انتقام میں کس حد تک پہنچ جاتا ہے۔

سلسبیل پریکیشن

اکثر بزموں کی طرف سے دریافت کیا گیا ہے کہ آیا انہیں سلسبیل پریکیشن مل سکے گا، اطلاعاً عرض ہے کہ جس قدر فرمائشیں، بزم کے نمائندہ کی معرفت موصول ہوں گی۔ ان پر ۲۵ فی صد کے حساب سے کمیشن دیا جائے گا۔ (ادارہ طلوع اسلام)

بَابُ المَراسلاتْ

۱ — غیر مسلموں کے نیک اعمال کا بدلہ۔

۲ — اخلاقی اور روحانی ترقی۔

۳ — اسلامی قوانین کب بنیں گے؟

۴ — تعلق باللہ۔

۵ — حقوق اللہ وحقوق العباد۔

۶ — چار سوالات اور ان کا جواب۔

سوال۔ غیر مسلموں کے نیک اعمال کا بدلہ

کہا جاتا ہے کہ نجات صرف مسلمان کی ہوسکتی ہے۔ کافر کی نہیں ہوسکتی۔ ایک غیر مسلم بڑے نیک کام کرتا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ چوری نہیں کرتا۔ کسی کو ستاتا نہیں۔ خیرات کرتا ہے۔ غریبوں کی مدد کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو کیا اُسے اس کے ان نیک کاموں کا کوئی اجر نہیں ملیگا اور اس کی اس لئے نجات نہیں ہوگی کہ وہ مسلمان نہیں ہوا اور ایک مسلمان محض اس لئے جنت میں چلا جائے گا کہ وہ مسلمان تھا خواہ اس کے اعمال کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں۔ اس سوال نے مجھے ایک مدت سے پریشان کر رکھا ہے اور اس کا تسلی بخش جواب کہیں سے نہیں ملتا۔

جواب

اس سوال نے صرف آپ ہی کو پریشان نہیں کر رکھا۔ بہت سوں کو پریشان کر رکھا ہے اور اس کا تسلی بخش جواب اس لئے نہیں ملتا کہ بنیادی طور پر یہ بات صاف نہیں کی جاتی کہ اسلام کہتے کسے ہیں۔ اور کفر ہوتا کیا ہے۔ یہ بنیادی چیز سمجھ میں آجائے تو اس بظاہر پریشان کن سوال کا جواب آسانی سے مل جاتا ہے لہٰذا پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اسلام کے معنی کیا ہیں؟ یہ ہے کیا؟ کفر اور اسلام میں فرق کیا ہے؟ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ کفر اور اسلام میں فرق صرف کھانے پینے کی چیزوں میں جائز اور ناجائز کی تمیز یا پرستش کے طور طریقوں میں اختلاف ہے۔ اصل سب مذاہب کی ایک ہی ہے۔ مولانا آزاد مرحوم کے الفاظ میں "عالمگیر سچائیاں ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ فرق صرف ظاہری اعمال و رسوم میں ہے۔ اور اس فرق کا نجات و سعادت سے کچھ تعلق نہیں۔" یہ ہے اسلام کے متعلق وہ بنیادی غلط فہمی جس کی وجہ سے وہ تمام سوالات سینے میں اُبھرتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اور جو وجہ خلش و اضطراب بنتے ہیں۔

قرآن کریم چند مستقل اقدار۔ چند غیر متبدل اُصول۔ چند ابدی حقائق عطا کرتا ہے جن کی بنیادوں پر انسانی معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ کفر، ان اقدار، اُصول اور حقائق سے انکار کا نام ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جن باتوں کو عام طور پر "نیک کام" کہا جاتا ہے (اور جن کی مثالیں آپ نے بھی پیش کی ہیں)، اس معاشرہ میں جو خلاف ان بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، ان کی حقیقت اور وزن کیا ہوتا ہے؟ یہ بات ایک مثال سے سمجھ میں آسکے گی۔ ہندو نظریۂ حیات کی رُو سے انسانوں کی تفریق و تقسیم پیدائش کی رُو سے ہو جاتی ہے۔ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ، محض پیدائشی نسبت سے، ہر شخص کے نزدیک واجب الاحترام ہوتا ہے اور اسے معاشرہ میں وہ مقام اور حقوق حاصل ہوتے ہیں جن

میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس، شودر کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ، تمام عمر ذلت اور پستی کی زندگی بسر کرتا ہے اور کوئی طریق ایسا نہیں جس سے وہ معاشرہ میں عزت اور وقار کا مقام حاصل کر سکے۔ خواہ اس کے جوہرِ ذاتی کچھ ہی کیوں نہ ہوں[1]۔ برہمن ساری عمر اس نظریۂ زندگی کی تلقین کرتا رہتا ہے اور اسے خدائی تفریق قرار دیتا ہے جسے دنیا کا کوئی انسان مٹا نہیں سکتا۔ ہندو معاشرہ کی تشکیل اسی نظریۂ حیات کے مطابق ہوتی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ اگر یہ برہمن، ساری عمر جو اس معاشرہ کے بندھنوں کو مضبوط سے مضبوط کرتا رہتا ہے۔ اور اس طرح کروڑوں انسانوں کو ذلت و خواری کے جہنم میں دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ اگر یہ کہ وہ چوری نہیں کرتا۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ یا وہ مویشیوں کے پانی پینے کے لئے پیاؤ بنواتا ہے۔ کوڑھیوں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے ڈالتا ہے۔ یا اس قسم کے اور "دان پن" کا کام کرتا ہے۔ تو کیا اس کی یہ انفرادی "نیکیاں" انسانیت کی میزان میں کچھ بھی وزن رکھیں گی؟ کیا معاشرہ کو غلط بنیادوں پر استوار کرنے کا وہ جرم عظیم جس کا یہ مرتکب ہوتا ہے، ان "نیکیوں" کے صدقے میں قابلِ معافی تصور کیا جا سکے گا۔ اگر میزان کے ایک پلڑے میں یہ نیکیاں رکھی جائیں اور دوسرے پلڑے میں اس کا وہ جرم، تو سوچئے کہ ان میں سے کون سا پلڑا بھاری ہوگا؟ ہماری بھول یہ ہے کہ ہم اس قسم کی انفرادی نیکیوں کو بہت بڑے ثواب کا کام سمجھتے ہیں اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ اصول و مبانی کیا ہیں جن کے مطابق انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ اصل شے، وہ نظام ہے جسے انسان قائم کرتا اور اس کے اندر زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر وہ نظام صحیح ہے تو اس کے اندر اس قسم کی انفرادی نیکیاں انسانیت ساز نتائج مرتب کرتی ہیں اگر وہ نظام ہی باطل کی تخریبی بنیادوں پر استوار ہے تو اس میں افراد کی اس قسم کی نیکیاں اس جرم کا کفارہ نہیں ہو سکتیں جو انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لئے روا رکھا جا رہا ہے۔

قرآن کریم یہودیوں کے متعلق کہتا ہے کہ انہوں نے نظامِ زندگی ایسا قائم کر رکھا تھا جس میں خود ان کے اپنے افراد ایک دوسرے کا گلا کاٹتے تھے اور بالا دست لوگ کمزوروں اور ناتوانوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے تھے۔ اس کے بعد جب ان لوگوں کو دوسرے لوگ قید کر لیتے تھے تو یہ فدیہ دے کر انہیں چھڑاتے تھے اور اسے بڑا نیکی کا کام تصور کرتے تھے۔ الاّ انہ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ۔ خود

[1] اسی یہی تفریق و تقسیم دولت کی رُو سے ہوتی ہے۔ امیر آدمی کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ ابتدا ہی سے جس مقام پر فائز ہوتا ہے غریب آدمی کا بچہ ساری عمر اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ روح وہی ہے۔ صرف پیکروں کی تبدیلی ہوتی ہے۔ بدلتے ہیں زمانے میں پھر سے آتے ہیں ؎ اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

ان لوگوں کو گھروں سے باہر نکال دینا سخت جرم تھا۔ اس جرم کے ارتکاب پر تو ان کے دل میں کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی تھی لیکن قیدیوں کو چھڑا کر ثواب حاصل کرنے کے لئے وہ آگے بڑھتے تھے۔ اس کے بعد قرآن کریم نے ایک عظیم اصول بیان کیا ہے جو اس باب میں بڑی واضح راہنمائی دیتا ہے۔ وہ ان سے کہتا ہے اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ کیا تم یہ طرزِ عمل اختیار کرنا چاہتے ہو کہ ضابطۂ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھو اور اس کے دوسرے حصے سے انکار کرو۔ اگر یہی روش جاری رکھنا چاہتے ہو تو سن رکھو کہ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵)۔ اس روش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اس دنیا میں بھی ذلت و خواری کی زندگی بسر کرو گے اور قیامت میں سخت ترین عذاب میں مبتلا ہو گے۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے یہاں کس قدر بلیغ اور بلند اصول بیان کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ قیدیوں کو فدیہ دے کر چھوڑانا بہرحال ایک نیک کام ہے جس کا اجر ملنا چاہیئے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ انسانیت پر ظلم کرنے والے غلط نظام کے اندر اس قسم کی انفرادی نیکیاں موجبِ ثواب نہیں بن سکتیں۔ اس جرم کا سیلاب اس قسم کی جزئی "مرمتوں" کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اور اس تمام عمل کا کوئی نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اس قسم کی غلط ذہنیت قریش مکہ کی تھی جس کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ان سے کہا گیا کہ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کو پانی پلانے کے لئے سبیلیں لگا دینا یا خانہ کعبہ کی تعمیر و تزئین کے کاموں میں حصہ لینا اس شخص کے اعمال کے برابر ہے جو صحیح نظامِ زندگی کی ابدی حقیقتوں (ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت) پر یقین رکھتا ہے اور پھر اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے مسلسل جد و جہد کرتا رہتا ہے؟ تم اپنے ذہن سے کچھ ہی کیوں نہ فیصلہ کرلو۔ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ۔ میزانِ خداوندی میں ان کا وزن برابر نہیں ہو سکتا۔ غلط نظام قائم کرنے والے اس قسم کے انفرادی نیک کاموں کے باوجود ظالم کے ظالم رہتے ہیں اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ظلم کرنے والوں پر نجات و سعادت کی راہیں کبھی کشادہ نہیں ہوتیں۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۹/۱۹)۔

ہمارا خیال ہے کہ ان مختصر سی توضیحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ "کافر" کے نیک اعمال میزانِ خداوندی میں وزن کیوں نہیں رکھتے! جو شخص کسی مملکت کے خلاف بغاوت کے لئے

اللہ کفر ا ہو، وہ ذاتی طور پر کتنا ہی اچھا شخص کیوں نہ ہو اس کی یہ انفرادی خوبیاں جرم بغاوت کا کفارہ نہیں بن سکتیں۔ کفر، درحقیقت نظام خداوندی کے خلاف بغاوت کا نام ہے ـــــ خواہ وہ بغاوت عملی ہو یا ذہنی (اعتقادی)۔

باقی رہا یہ کہ مسلمان، بغیر نیک اعمال کے بھی جنت میں چلا جائے گا تو یہ "حدیث بہ جولاں" ہے۔ جس کا حقیقت سے کچھ تعلق نہیں۔ جنت تو نام ہی اعمال کے فطری نتائج کا ہے۔ وَ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۳/۷۲)۔ البتہ اس ضمن میں دو ایک بنیادی باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) اگر کہیں صحیح قرآنی نظام قائم ہے ـــــ یا اس کے قیام کے لئے جدوجہد کی جارہی ہے تو اس میں اگر کسی سے سہواً اور خطاءً کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہو گئی ہے اور وہ اس پر نادم ہو کر آئندہ اس سے محتاط رہتا ہے تو اس کے اعمال حسنہ کا پلڑا بھاری رہے گا۔

(۲) اگر مسلمان بھی غیر قرآنی نظام پر رضامند ہو چکا ہے تو اس نظام کے اندر اس کی انفرادی نیکیاں وہ نتائج مرتب نہیں کر سکتیں جن کا نتیجہ جنت کی زندگی ہوتا ہے۔ ہم (مسلمان) صدیوں سے اسی غلط ذہنیت کا شکار ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے نیک لوگوں کی نیکیاں بھی کوئی نیک نتیجہ مرتب نہیں کرتیں۔ یہی وہ غلط ذہنیت ہے جس کی اصلاح کے لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ

> نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ نیکی تو اس کی ہے جو
>
> (i) خدا پر۔ آخرت پر۔ ملائکہ پر۔ کتب خداوندی پر اور انبیاء پر ایمان رکھتا ہے۔
> (یعنی ان اصولوں پر جو نظام خداوندی کی بنیاد بنتے ہیں)۔
>
> (ii) مال اور دولت کی محبت کے باوجود، اسے ضرورت مند قریبیوں۔ یتیموں، مسکینوں، نادار مسافروں۔ محتاجوں کے لئے دے دیتا ہے۔ نیز دوسروں کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے۔
>
> (iii) جو نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ قائم کرتا ہے۔
>
> (iv) جو اپنے عہد کا پابند ہوتا ہے (اور اس عہد میں بنیادی حیثیت اس عہد کی ہوتی ہے جو اس نے اپنے خدا سے کر رکھا ہوتا ہے۔ اور جس کی رو سے اس نے اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھوں بیچ دیا ہوتا ہے۔ (۹/۱۱۱)۔

(۱۱) جو ان مصائب و مشکلات میں جو اس راہ میں اسے درپیش ہوں ثابت قدم رہتا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دعوئے ایمان کو سچ کر دکھاتے ہیں۔ اور یہی ہیں جنہیں متقی کہا جاسکتا ہے۔ (۲/۱۷۷)۔

نیکی ان لوگوں کی ہے نہ کہ ان کی جو غیر خداوندی نظام پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر انفرادی نیکیاں انہیں جنت کا وارث بنا دیں گی۔

آپ نے غور فرما لیا کہ غیر مسلموں کی انفرادی نیکیاں تو ایک طرف، خود ان مسلمانوں کی انفرادی نیکیاں، جو غیر خداوندی نظام پر مطمئن ہوں، میزان خداوندی میں کیا وزن رکھتی ہیں؟ انفرادی نیکیاں نہایت ضروری ہیں۔ لیکن یہ نیکیاں صحیح نتائج پیدا ہی اس وقت کرتی ہیں جب یہ صحیح قرآنی نظام کے اندر سرزد ہوں۔ غلط نظام میں یہ تعمیر انسانیت کے نتائج مرتب ہی نہیں کر سکتیں۔ دریاؤں اور ندیوں کا میٹھا پانی، انسانوں اور حیوانوں کے لئے زندگی بخش اور زمین مردہ کے لئے حیات آور ہوتا ہے لیکن وہی پانی سمندر کے اندر پہنچ کر اپنی تمام زندگی بخش صلاحیتیں کھو دیتا ہے۔ دہی کے برتن میں جتنا دودھ جی چاہے ڈالتے جایئے۔ سب دہی بنتا جائے گا ـــ قرآنی نظام ـــ یا اس نظام کے قیام کے لئے جدوجہد ـــ اور اس کے ساتھ اخلاقی نیکیاں۔ یہ ہے وہ پروگرام جسے قرآن "ایمان اور اعمال صالح" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس کا لازمی نتیجہ اس دنیا اور اس کے بعد کی زندگی دونوں میں جنت کی وراثت ہے اور یہ پروگرام قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔

۲۔ سوال۔ اخلاقی اور روحانی ترقی

ہم عام طور پر سنتے رہتے ہیں کہ اسلام، مادی، اخلاقی اور روحانی ترقی کا ضامن ہے "مادی ترقی" قابل فہم ہے۔ "اخلاقی ترقی" کی بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ لیکن یہ "روحانی ترقی" کیا ہے اور اسلام اس کا کس طرح ضامن ہوتا ہے؟۔

جواب

اس کا جواب تو انہی سے مانگئے جو ان الفاظ کو پیش کرتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا جواب ان کے پاس بھی کچھ نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں اکثر الفاظ ایسے ہیں جن کی کیفیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اسماء سمیتموھا انتم وآباءکم۔ (چند نام ہیں جنہیں تم نے یا تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑا ہے) ان الفاظ کو ہم صبح شام سنتے اور دہراتے رہتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ان کا

مطلب کیا ہے۔

"اخلاقی ترقی" کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، انسان کے اخلاق بلند ہو جاتے ہیں اور اخلاق، سیرت وکردار ہی کا دوسرا نام ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی کے بعد کوئی اور چیز بھی باقی رہتی ہے جسے "روحانی ترقی" سے تعبیر کیا جاتا ہے؟ کیا اخلاقی بلندی (سیرت وکردار کی رفعت) میں شرفِ انسانیت کی انتہائی منزل نہیں آجاتی؟ یہ بات تو واضح ہے کہ مادی ترقی اور چیز ہے اور اخلاقی برتری اور شے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ فرد یا قوم کو مادی ترفع حاصل ہو لیکن اس کی اخلاقی سطح پست ہو۔ یہ وجہ ہے کہ اسلامی طرزِ زندگی کے نتائج کے لئے مادی ترقی کے ساتھ اخلاقی ترقی کا اضافہ ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اخلاقی برتری کے بعد وہ کون سی چیز باقی رہ جاتی ہے جسے "روحانی ترقی" سے تعبیر کیا جاتا ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم، شرفِ انسانیت کی جس انتہائی بلندی کو بطور نصب العین پیش کرتا ہے حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی اس ارفع و اعلیٰ مقام کی مظہرِ اتم ہے۔ اس لئے قرآن کریم کہتا ہے کہ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸/۴)۔ "اے رسول! تو اخلاق کے عظیم ترین مقام پہ فائز ہے"۔ قرآن کریم نے حضورؐ کے لئے اخلاقی بلندی کا ذکر کیا ہے۔ "روحانی ترقی" کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - اب سوال یہ ہے کہ اخلاقی بلندی کے بعد وہ روحانی ترقی کون سی ہے جس کا ذکر نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کے سلسلے میں تو آیا نہیں لیکن جس کا ہم اس طرح دن رات چرچا کرتے رہتے ہیں؟ اصل یہ ہے کہ انگریزی زبان میں تین الفاظ تھے۔ (MATERIAL) یعنی مادی۔ (MORAL) یعنی اخلاقی۔ اور (SPIRITUAL) یعنی روحانی۔ ہم نے اپنے ہاں انہی اقنومِ ثلاثہ کو دہرانا شروع کر دیا اور اس کا خیال تک نہ کیا کہ عیسائیت نے تو مادہ (MATTER) اور روح (SPIRIT) کی ثنویت کے لئے اس اصطلاح کو وضع کیا تھا۔ اور مادہ کو قابلِ نفرت قرار دینے کے بعد، اس کی ضد (SPIRIT) کو انسانی ترقی کا منتہیٰ ٹھہرایا تھا۔ لیکن اسلام میں اس قسم کی ثنویت نہیں۔ نہ ہی اس کے نزدیک مادہ قابلِ نفرت شے ہے پھر ہم (SPIRIT) کا لفظ کس مقصد کے لئے بولتے ہیں؛ ہم نے اس اصطلاح کو عیسائیت سے مستعار لے کر اپنے "تصوف" میں داخل کیا اور اس طرح روحانی ترقی انسانی شرف کی منتہیٰ قرار پا گئی۔ اور پھر اس کا چرچا شروع کر دیا کہ شریعت کی پابندی سے اخلاقی بلندی حاصل ہوتی ہے۔ اور طریقت کی پابندی سے روحانی ترقی۔ یعنی جس (اخلاقی) بلندی کو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ کا مقام بلند قرار دیا ہے، تصوف کے اس تصور کی رو سے

اس مقام سے اونچا ایک اور مقام بھی ہے جسے روحانی ترقی کہا جاتا ہے — یعنی (معاذ اللہ، معاذ اللہ) خود نبی اکرمؐ کے مقام (خلقِ عظیم) سے بھی بلند مقام!

پھر سُن لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی اخلاقی بلندی ہی کا ذکر کیا ہے۔ روحانی ترقی کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اس لئے خدا کی اس شہادت کے پیشِ نظر اسلام میں سیرت کے اعتبار سے اخلاقی بلندیوں سے اونچا کوئی اور مقام نہیں۔ (نبوت البتہ اور چیز ہے جس کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے)۔

۳۔ سوال۔ اسلامی قوانین کب بنینگے؟

پاکستان بننے سے ہمیں کم از کم اتنی خوشی ضرور تھی کہ ہماری عمر کا پہلا حصہ تو غیر اسلامی قوانین کے تابع گزرا ہے، اب بقایا حصہ اسلامی قوانین کے مطابق بسر ہوگا۔ لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ مجھ جیسے عمر رسیدہ لوگ شاید یہ حسرت لئے کر ہی دُنیا سے چلے جائیں۔ بہت سے ساتھی اس دوران میں اسی آرزو میں دنیا سے چل بسے ہیں۔ باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ کیا آزادی کے بعد، ہماری اتنی سی حسرت بھی پوری نہیں ہو سکے گی؟

جواب

نظر تو یہی آتا ہے کہ ہم سب اس حسرت کو ساتھ لئے کر دُنیا سے چل بسیں گے۔ ہمارے حضرات علمائے کرام جس روش پر چلنے کے لئے مصر ہیں اس کے پیشِ نظر پاکستان میں اسلامی قوانین کے مرتب ہو جانے کے کوئی امکانات دکھائی نہیں دیتے۔ سنہ ۱۹۶۲ء کے آئین میں مختلف فرقوں کے لئے الگ الگ پرسنل لاز کا وجود ختم کر دیا گیا تھا۔ ان حضرات نے اس کے خلاف شور مچادیا۔ اور آئین میں پھر سے اس شق کو شامل کرادیا کہ پرسنل لاز ہر فرقے کے الگ الگ ہوں گے۔ اب یہ اپنی اس کامیابی پر بہت خوش اور اس جہادِ عظیم پر بڑا فخر کرتے ہیں کہ ہم نے امت میں وحدت نہیں پیدا ہونے دی۔ کتنا بڑا ہے یہ معرکہ جو انہوں نے مارا ہے — حدیاں رقص کناں نعرۂ مستانہ زنند۔

ہر فرقہ کے لئے اپنے اپنے پرسنل لاز کی وجہ (یا ضرورت) یہ بتائی جاتی ہے کہ

(۱) قوانین، کتاب و سنت کے مطابق وضع ہوں گے۔

(۲) اور کتاب و سنت کی تعبیر ہر فرقہ کی الگ الگ ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب پرسنل لاز کے بعد، پبلک لاز مرتب کرنے کی نوبت آئے گی تو کیا یہی صورت وہاں بھی پیدا نہیں ہوگی؟ اس وقت، کتاب و سنت کی کون سی تعبیر کے مطابق قوانین مرتب کئے جائیں گے۔ اور کسی ایک فرقہ کی تعبیر کے مطابق وضع کردہ قانون، دوسرے فرقہ والوں کے نزدیک کس طرح اسلامی

(فلہٰذا قابلِ قبول) ہوگا؟ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ ظاہر ہے کہ زنا پبلک لاء کے ماتحت آئے گا۔ اور اس جرم کی سزا مقرر کی جائے گی۔ لیکن زنا کی تعریف (DEFINITION) کے متعلق شیعہ اور سنی حضرات میں بنیادی اختلاف ہے۔ شیعوں کے نزدیک جنسی اختلاط کی جس شکل کو متعہ (اور بالکل جائز) قرار دیا جاتا ہے، سُنّی حضرات اسے زنا کہتے ہیں۔ جب شیعہ اور سنی حضرات زنا کی تعریف پر ہی متفق نہیں ہوں گے تو ان دونوں کے لئے متفق علیہ قانون کیسے بن جائے گا اور اگر متعہ کو پرسنل لاء کی شق میں داخل کر دیا گیا تو سُنّی حضرات کے تصور کے مطابق زنا کا ہر ملزم اپنے آپ کو شیعہ کہہ کر جرم کی سزا سے بچ جائے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے حضرات علماء کرام خیر سے کر کیا رہے ہیں؟ کیا ان کے پیش کردہ تصور کے مطابق یہاں اسلامی قوانین کے مرتب ہو جانے کا کوئی امکان ہو سکتا ہے؟ آپ دیکھ لیجئے کہ یہاں ناگزیر الامر ہوگا وہی جسے طلوع اسلام پہلے دن سے کہتا چلا آ رہا ہے۔ یعنی یا تو اس صورت کو اختیار کرنا ہوگا کہ اسلامی قوانین کی اصل و بنیاد قرآن کریم ہے اور اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو لوگ تنگ آ کر یہاں سیکولر نظام قائم کر لیں گے۔ مملکت لاقانونیت کے گرداب یا "بین بین" کے برزخی اضطراب میں کب تک رہ سکتی ہے؟

۴۔ سوال۔ تعلق باللہ

میں آپ کے درس میں اکثر شریک ہوتا ہوں۔ آپ اس میں قرآن شریف کے حقائق کو خوب بیان کرتے ہیں۔ اس کے احکام کی حکمت وغیرہ کی بھی خوب وضاحت کرتے ہیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اس میں تعلق باللہ کی بات کوئی نہیں ہوتی۔ کیا آپ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں؟

جواب

میں سمجھ نہیں سکا کہ تعلق باللہ سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ میں اپنی بصیرت کے مطابق جو کچھ سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارا اور خدا کا تعلق اس کتاب کے ذریعہ سے ہے۔ جو اس نے ہماری راہنمائی کے لئے نازل کی ہے۔ اس کے علاوہ خدا اور بندے کا تعلق میری سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرات انبیائے کرامؑ کا خدا سے تعلق وحی پانے کا تھا وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب ہم میں اور خدا میں واسطہ اس کی کتاب عظیم ہی ہے جب ہم اس کی کتاب پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے ہمکلام ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نے وہ باتیں ہم ہی کو مخاطب کر کے کی ہیں۔ خدا کی اس ہمکلامی میں کسی کی تخصیص نہیں۔ اس نے اس میں "الناس" (تمام انسانوں) کو مخاطب کیا ہے۔ لہٰذا جب ہم قرآن کریم کو پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں تو

خدا سے ہمارا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ جب ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں تو خدا سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ خدا کے ساتھ اس تعلق میں کوئی راز نہیں۔ کوئی سربستہ نہیں۔ کوئی باطنیت نہیں۔ یہ تعلق کھلے بندوں قائم ہوتا ہے۔ ڈنکے کی چوٹ قائم ہوتا ہے۔ ہر ایک اس تعلق کو دیکھ سکتا ہے۔ پرکھ سکتا ہے۔ خود قائم کر سکتا ہے۔ قائم کرا سکتا ہے۔ یعنی خود علم و بصیرت کی رُو سے قرآن کو سمجھ سکتا ہے۔ دوسروں کو دلیل و برہان کی رُو سے سمجھا سکتا ہے۔ خدا اس پر عمل کر سکتا ہے۔ دوسروں سے عمل کرا سکتا ہے اور اس عمل بالقرآن کے زندہ و محسوس نتائج دُنیا کے سامنے آ سکتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کریم کی رُو سے تعلق باللہ کی شکل۔ اس کے علاوہ کسی اور تعلق باللہ کا پتہ نشان قرآن سے نہیں ملتا۔ (پرویز)

۵۔ سوال ۔ حقوق اللہ و حقوق العباد

ہم بچپن سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی اصطلاحات سنتے چلے آ رہے ہیں۔ حقوق العباد کی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن یہ "حقوق اللہ" کیا ہیں، اس کی بابت وضاحت کر دیجئے۔

جواب

قرآن کریم میں حقوق العباد کا تو ذکر آیا ہے لیکن حقوق اللہ کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ مثلاً فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔۔۔ (۷۰/۲۴) "ان کے مال میں سائل و محروم کا الیاحق ہے جو معلوم ہے" یا وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۔۔۔ (۱۷/۲۶) قریبی اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دے دو۔ اس قسم کی قرآن کریم میں اور آیات بھی ہیں۔ ایک جگہ خدا کے حق کا بھی ذکر ہے لیکن وہ حق بھی در اصل بندوں ہی کا حق ہے۔ سورۃ انعام میں ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے باغات اور کھیتوں میں پھل اور فصلیں پیدا کی ہیں۔ تم اس پیداوار کو اپنے کام میں لاؤ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۔۔۔۔۔۔ (۶/۱۴۱)۔ اور فصل کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کر دو۔ ظاہر ہے کہ یہاں جس چیز کو "اس کا (خدا کا) حق" کہا گیا ہے، یہ وہی ہے جسے دوسرے مقامات میں محتاجوں اور ضرورت مندوں کا حق قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح "خدا کو قرضہ دینے" سے مراد ہے انسانیت کی فلاح و بہبود کے کاموں کے لئے نظامِ خداوندی کو اپنا مال دے دینا۔ یا جہاں کہا گیا ہے کہ "خدا نے مومنین کا مال اور جانیں خرید لی ہیں" تو اس سے بھی مقصود یہی ہے کہ جماعتِ مومنین اپنے مال اور اپنی جانوں (اور جذبات) کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ ان

مقامات سے ظاہر ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد ایک ہی بات ہے۔ حقوق اللہ حقوق العباد سے الگ کچھ اور نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت میں جو ثنویت تھی کہ ـــــ خدا کا حصہ خدا کو دو اور قیصر کا قیصر کو ـــــ تو اسی تصور کو ہمارے ہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تفریق کی شکل میں پیش کر دیا گیا۔ لیکن اسلام میں اس تفریق کی کوئی گنجائش نہیں۔ دین نام ہے انسانوں کے باہمی تعلقات یا معاملات کو قوانین خداوندی کے مطابق استوار یا طے کرنے کا۔ جس چیز کو فرد کی اصلاح (یا انسانی ذات کی نشوونما) کہا جاتا ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ بھی انسانوں کے باہمی تعلقات اور معاملات کے صحیح خطوط پر متشکل ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص پہاڑ کے کسی غار یا جنگل میں ایسی جگہ رہتا ہے جہاں کوئی دوسرا انسان نہیں بستا۔ اور اس طرح اس کا معاملہ کسی دوسرے انسان سے نہیں پڑتا۔ تو اس کے لئے نہ دین کی ضرورت کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ وحی کی راہنمائی کا۔ نہ اس کے لئے حقوق العباد ہوتے ہیں نہ حقوق اللہ۔ اس کی یہ زندگی انسانی سطح کی زندگی ہوتی ہی نہیں۔ حیوانی سطح کی ہوتی ہے۔

عام طور پر "عبادات" کو حقوق اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن قرآنی تصورحیات کی رُو سے عبادات بھی مقصود بالذات نہیں۔ ان سے مقصد؛ انسان کی ایسی اصلاح ہوتی ہے جس سے انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش اسلوبی پیدا ہو۔ اور ان کے معاملات 'عدل اور احسان کی مستقل اقدار' کے مطابق طے پائیں۔ اس لئے "عبادات" بھی درحقیقت حقوق العباد کی حسن کارانہ انداز سے ادائیگی کا ذریعہ ہیں۔

۲۔ قرآن کریم اور عقل انسانی

لاہور سے ایک صاحب نے ذیل کے چار سوالات بھیجے ہیں۔

(۱) قرآن مجید ایک الہامی کتاب ہے۔ آپ کے نزدیک اس کے حق میں عقلی و نقلی داخلی اور خارجی شہادتیں کیا ہیں؟

(۲) اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید ایک وجدانی تخلیق ہے تو اس کی تردید میں آپ کا کیا جواب ہو گا؟

(۳) کیا عقل اس وحی ربانی یعنی قرآن کی ترجمانی تصریح اور تشریح کرنے کی اہل ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ عقل انسانی کی رسائی وہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اس میں تصریح اور تشریح کی صلاحیت آگئی ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ اب شارح اور مفسر حقیقی کی ضرورت باقی نہیں؟ اندریں صورت ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ عقل اس حد تک پختہ ہو گئی ہے کہ وہ وحی کا احاطہ کرنے کے قابل ہے تو پھر وحی کی ضرورت

جو تکمیلِ عقل انسانی کے لئے لازمی تھی غیر ضروری ہو جاتی ہے اور اس کو چھوڑ دینا چاہیئے۔

۴ اگر یہ مانیں کہ عقل انسانی اپنے ارتقاء کے لئے وحی کی اب بھی محتاج ہے تو اس سے استفادہ کرنے کے لئے اس مفسر اور شارح کی جو وحی کے ہر جزو پر کلیتہً اور کاملاً احاطہ اور اطلاع رکھتا ہو موجودہ زمانے میں اس کی نشان دہی کی جائے۔

مندرجہ بالا استفسارات کا جواب اگر انفرادی طور پر دیا جا سکے تو یہ عنایت خصوصی ہوگی ورنہ بصورت دیگر از راہ لطف مطلع فرمایا جائے کہ آپ کے کس مجلہ عالیہ میں جوابات اشاعت پذیر ہوں گے تاکہ اسے خرید لیا جائے۔ والسلام۔

جواب۔

(۱) سب سے پہلے اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کے لئے "الہامی" کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ (اس کے لئے، یا کسی دوسری آسمانی کتاب کے لئے یہ لفظ قرآن میں نہیں آیا) یہ وحیٔ خداوندی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب رسول اللہ کے اپنے ذہن کی تخلیق نہیں۔ اسے خدا نے رسول اللہ پر نازل کیا اور حضورؐ نے اسے اسی طرح انسانوں تک پہنچا دیا۔ وحیٔ خداوندی میں (OBJECTIVITY) کا تصور بنیادی ہوتا ہے۔ اس میں (SUBJECTIVITY) کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیت صرف وحی کو حاصل ہے۔

جہاں تک داخلی اور نقلی شہادت کا تعلق ہے، قرآن کریم شروع سے اخیر تک اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کئے جاتا ہے کہ اسے خدا نے وحی کیا۔ (وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ — ۶/۱۹ وَاَوْحَیْنَا اِلَیْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ — ۱۲/۳ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی — ۵۳/۳۔ وغیرہ) اس کی دلیل اس کا یہ دعوٰے ہے کہ وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ..... (۲/۲۳) اگر تمہیں اس میں شک ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو تم اس کی مانند ایک سورت بنا کر دکھاؤ۔ چونکہ یہ چیلنج تمام انسانوں کے لئے ہے (ہر قوم کے انسانوں کے لئے اور ہمیشہ کے لئے) اس لئے اس سے مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ انسانی کوشش کی تخلیق نہیں۔ اور یہ حقیقت کہ اس چیلنج کو آج تک کسی نے قبول (ACCEPT) نہیں کیا۔ اس دعوے کی صداقت کی دلیل ہے۔

قرآن کریم کے من جانب اللہ ہونے کی ایک عقلی دلیل تو وہی ہے جس کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے یعنی اس کا یہ چیلنج کسی نے قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد اس تیرہ سو سال کی انسانی تاریخ خود اس کی شہادت

بہم پہنچائی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی طول طویل ہے اور اس کا ایک استفسار کے جواب میں سمٹانا مشکل۔ اس لئے سردست چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مثلاً۔

(۱) نزول قرآن کے وقت ساری دنیا کا فیصلہ یہ تھا کہ ملوکیت کا نظام سیاست عین "فطرت انسانی" کے مطابق ہے۔ بادشاہ ایشور کا اوتار اور خدائی اختیارات کا حامل ہوتا ہے۔ اس سے بہتر نظام کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ قرآن نے اس کی تردید کی اور کہا کہ انسانوں کو اپنے معاملات (وحی کی مستقل اقدار کی روشنی میں) باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔ کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔

(۲) انسانی ذہن کا اس زمانے تک یہ فیصلہ تھا کہ غلاموں کا وجود انسانی معاشرہ کے لئے ضروری ہے اور فطرت کی صحیح تعلیم کا نتیجہ۔ قرآن کریم نے یہ انقلابی تصور دیا کہ کسی انسان کا دوسرے انسان کو اپنا غلام بنالینا یکسر خلاف انسانیت ہے۔

(۳) اس زمانے میں انسانوں کی تقسیم و تفریق پیدائش کے اعتبار سے ہوتی تھی۔ برہمن کا بیٹا برہمن اور محض برہمن کے گھر پیدا ہو جانے سے واجب التکریم۔ بادشاہ کا بیٹا شاہزادہ۔ لارڈ کا بیٹا لارڈ۔ سردار کا بیٹا سردار۔ قرآن کریم نے کہا کہ یہ تقسیم یکسر غلط ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے کسی انسان کو دوسرے انسان پر فوقیت حاصل نہیں۔ فوقیت ہر انسان کے جوہر ذاتی اور سیرت و کردار کی بنا پر ہونی چاہیئے۔

(۴) اس زمانے میں انسان مختلف گروہوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ قرآن کریم نے کہا کہ تمام انسان ایک خاندان کے افراد اور ایک درخت کی شاخیں ہیں۔ لہٰذا تمام دنیا کے انسانوں کو امت واحدہ (ایک قوم) کی حیثیت سے رہنا چاہیئے۔ ان کا ایک اجتماعی نظام اور ایک ضابطۂ زندگی ہونا چاہیئے۔

آپ ان چند مثالوں پر غور کیجئے اور سوچئے کہ کیا یہ اصول اس دور کے انسان کے ذہن کی تخلیق ہو سکتے تھے؟ اور کیا انسانی زندگی کے تجربے نے ان اصولوں کے صحیح ہونے کی تائید کی ہے یا تردید؟ کیا انسانی ہیئت اجتماعیہ کا رُخ اس سمت کو ہے جسے قرآن نے متعین کیا تھا یا کاروان انسانیت اس کے خلاف سمت کی طرف جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں انسانی علم اور تجربہ آگے بڑھتا جا رہا ہے وہ قرآن کے دیئے ہوئے اصول و اقدار کی صداقت کی شہادت بہم پہنچاتا جا رہا ہے۔

(۳) "وجدانی تخلیق" سے غالباً آپ کی مراد یہ ہے کہ جس طرح ایک شاعر اپنے خیالات کے متعلق کہتا ہے کہ وہ

(INSPIRED) ہیں۔ یہی کیفیت وحی کی ہوتی ہے۔ یہ غلط ہے۔ جسے شاعری یا فلسفہ کی اصطلاح میں (INSPIRATION) یا (INTUTION) کہا جاتا ہے۔ وہ ذہن انسانی (HUMAN MIND) ہی کی تخلیق ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر اس کے لئے کوئی شعوری توجیہہ نہیں پیش کر سکتا۔ اس لئے وہ نفسیات (PSYCHOLOGY) کی اصطلاح میں نفس غیر شعوری یا لاشعور (UN-CONSCIOUS MIND) کی تخلیق ہوتا ہے۔ لیکن ہوتا ہے وہ بہرحال داخلی (SUBJECTIVE)۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، وحی کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ وہ انسان کے نفس شعوریہ یا لاشعوریہ کی پیداوار ہوتا ہی نہیں۔ اس میں نفس انسانی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ "وجدانی تخلیق" کے لئے شاعری یا کہانت کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ نبی نہ تو کاہن ہوتا ہے نہ شاعر۔ اس سے قرآن نے، وحی اور وجدانی تخلیق میں فرق کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی اپنی مثال آپ ہوتی ہے۔ انسان کا کسی قسم کا کوئی ملکہ نہ وحی کو متشکل ہوتا ہے نہ اس کے مشابہ۔ یہ انسانی ملکہ ہوتا ہی نہیں۔

(۳) ایک چیز ہے وحی کی رُو سے عطا شدہ اصولِ حیات اور دوسری چیز ہے ان اصولوں کی غرض غایت اور حکمت۔ عقل انسانی، ان اصولوں کی غرض و غایت اور حکمت کو سمجھ سکتی ہے، اور اپنے دور کی علمی سطح تک ان کی تشریح کر سکتی ہے۔

لیکن آپ نے یہ بات عجیب کہہ دی کہ جب عقل انسانی، وحی کی حکمت کو سمجھنے کے قابل ہو جائے تو پھر اسے چاہیئے کہ وحی کو چھوڑ دے! مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ قدیم زمانے سے کسی طبیب کا کوئی نسخہ چلا آ رہا تھا جو تپ دق کے لئے بہت مفید تھا۔ لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ تپ دق کا ازالہ کس طرح سے کرتا ہے۔ زمانے نے ترقی کی۔ ایک طرف اس کی تحقیق ہوئی کہ تپ دق ہوتا کیوں ہے۔ دوسری طرف اس نسخے کے اجزاء کا لیبارٹری میں تجزیہ کر کے دیکھا گیا کہ ان میں کیا کیا بنیادی خصائص ہیں۔ اس طرح عقل انسانی نے معلوم کر لیا کہ وہ نسخہ تپ دق کے لئے اکسیر کا حکم کیوں رکھتا ہے۔

اب اگر آپ کی دلیل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چونکہ عقل انسانی نے یہ دریافت کر لیا ہے کہ وہ نسخہ تپ دق کا کامیاب علاج کیوں تھا؟ اس لئے اب اس نسخہ کو اٹھا کر پھینک دینا چاہیئے۔ وہ بیکار ہو گیا ہے۔ آپ سوچئے کہ کیا اس نسخے کے سلسلہ میں انسانوں کا یہ طرز عمل صحیح ہوگا۔ اس کے برعکس، اب اس نسخے کی اہمیت اور بھی بڑھ جانی چاہیئے۔ کیونکہ پہلے اس پر محض "عقیدۃً" عمل ہو رہا تھا اور اب اس پر علیٰ وجہ البصیرت عمل ہوگا۔ اور ہم ان لوگوں کو جنہیں اس سے پہلے اس کی افادیت

کے متعلق شک تھا دلیل و برہان سے سمجھا سکیں گے کہ وہ نسخہ کیوں اس قابل ہے کہ اسے تپ دق میں استعمال کیا جائے۔

ضمناً یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ وحی کا بنیادی فریضہ تکمیل عقل انسانی نہیں۔ اس کا بنیادی فریضہ تکمیل شرف انسانیت ہے۔ البتہ وہ عقل انسانی کو اس کی پختگی کی سند عطا کرتی ہے۔ یعنی جب علم و عقل انسانی کا کوئی فیصلہ وحی کے مطابق ہو تو اس وقت سمجھا جا سکتا ہے کہ علم و عقل صحیح نتیجے پر پہنچے ہیں۔

(۴) علم و عقل انسانی اپنے اپنے زمانے کی سطح تک وحی کے اصولوں کی غرض و غایت کو سمجھتے جائیں گے لیکن علم و عقل ان کی غایت کو کماحقہ سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں، ان اصولوں پہ عمل کیا جائے تو وہ اپنے انسانیت ساز تعمیری نتائج مرتب کرتے جائیں گے۔ (جس طرح مندرجہ بالا مثال میں، تپ دق کا نسخہ اس زمانے میں بھی اپنے نتائج مرتب کئے جا رہا تھا جب عقل انسانی اس کی حکمت سے واقف نہیں ہوئی تھی)۔ چونکہ قرآن کے اصول محکم، غیر متبدل اور ابدی ہیں اس لئے اب کسی نبی کی ضرورت نہیں۔ باقی رہا یہ تصور کہ ان اصولوں کو سمجھانے کے لئے کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے۔ جو خدا کی طرف سے ان اصولوں کو سمجھنے کا علم حاصل کرے۔ اور انہیں پھر دوسرے انسانوں کو سمجھائے تو یہ تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔ قرآن کریم نے کہیں یہ نہیں کہا کہ میری تعلیم کو سمجھانے کے لئے بھی کسی "مامور من اللہ" یا "ملہم ربانی" کی ضرورت ہے۔ قرآن کے مخاطب تمام دنیا کے انسان ہیں اور وہ انہیں تاکید کرتا ہے کہ وہ علم و عقل۔ فہم و بصیرت۔ تدبر و تفکر اور شعور و آگہی سے کام لے کر اس کی تعلیم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کا یہ مطلب صاف ہے کہ اس کی تعلیم کو سمجھانے کے لئے کسی "آسمانی شخصیت" کی ضرورت نہیں۔ علم و عقل انسانی اسے سمجھ سکتی ہے۔

آپ ذرا سوچئے کہ اگر اس نظریہ کو صحیح تصور کر لیا جائے کہ ختم نبوت کے بعد خدا کی کتاب کو سمجھانے کے لئے ضروری ہے کہ خدا ہی کی طرف سے کوئی انسان آئے تو یہ اس کتاب کا کتنا بڑا نقص ہے۔ اگر کوئی مصنف ایک کتاب تصنیف اور شائع کرے اور اس کے بعد ضرورت ہو کہ اس کتاب کو سمجھانے کے لئے وہ اپنے ہاں سے "ٹرنیڈ ٹیچرز" بھیجا کرے تو فرمائیے اس کتاب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہوگا؟ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ صاف، واضح، آسان، غیر مبہم کتاب ہے۔ اور اس کی تعلیم غور و فکر سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ اس لئے اس کو سمجھانے کے لئے خدا کو اپنی طرف سے "ٹرنیڈ ٹیچر" بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ اگر انسانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مامورین من اللہ کی ضرورت ہوتی تو سلسلۂ نبوت ختم کیوں کیا جاتا۔ نزول قرآن کے وقت رسول کی ضرورت اس لئے تھی کہ قرآن نجماً نجماً نازل ہو رہا تھا اور رسول اس کے مطابق معاشرہ متشکل کرتے جاتے تھے۔ جب قرآن مکمل ہو گیا۔ اور اس کی وارث امت وجود میں آگئی۔

لہٰذا نبوت ختم ہو گئی۔ اور قرآن اور امت آگے بڑھتے چلے گئے۔ ان کی موجودگی میں کسی "ما ھو من اللہ" کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ "شارع" خدا کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ انسان خدا کی عطا کردہ "شریعت" کو نافذ کرتے ہیں، شریعت وضع نہیں کرتے۔ اس اعتبار سے شریعت اور دین کا مفہوم ایک ہی ہے اگرچہ عام مفہوم کے اعتبار سے دین کو اصول اور شریعت کو اس کی جزئیات سمجھا جاتا ہے۔

سلسبیل

چھپ کر تیار ہو گئی ہے۔ فرمائشوں کی تعمیل، اسی ترتیب کے مطابق ہو گی جس ترتیب سے فرمائشیں موصول ہوں گی۔ فہرست عنوانات ملاحظہ فرمائیے۔

عبادت
نظریہ ارتقا اور قرآن
نجات
ثواب
زکوٰۃ
میثاق خداوندی
مملکت کا قرآنی تصور
لاہور کا ایک علمی مذاکرہ
انسان اور خارجی کائنات
اردو زبان میں نماز

قرآن کے باطنی معانی
اسلام کیا ہے؟
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟
دین خداوندی کے دشمن
انسان
شرک
ایک نورانی صبح
وہ مرد درویش
لارڈ سر برٹرنڈرسل سے ایک ملاقات
پروفیسر ٹائن بی سے چھ سوالات

کتاب سفید پرنٹنگ پیپر پر چھپی ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ صفحات ۳۵۲

قیمت مجلد آٹھ روپے

ادارہ طلوع اسلام لاہور ۲۵/بی گلبرگ سے طلب فرمائیے

روایات کا قرآن — قسط (۲)

مذکورہ روایات میں اختلافات

ہم نے جمع قرآن بعہد عثمانؓ کی روایات کو نمبروار درج کیا ہے ان میں مندرجہ ذیل اختلافات واضح طور پر سامنے آتے ہیں آپ نے بھی نوٹ کئے ہونگے تاہم ایک نظر پھر انہیں دیکھ لیجئے۔

۱۔ بخاری شریف کی روایت میں حضرت حفصہؓ سے مصحف منگوانے کا ذکر آیا ہے باقی کسی روایت میں یہ ذکر نہیں بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ جو آیات کاغذوں، چھالوں، ہڈیوں، چمڑوں وغیرہ پر لکھی ہوئی لائی گئیں انہی سے قرآن مرتب ہوا۔

۲۔ روایت نمبر (۱) میں ہے کہ نقل مصاحف کے کام پر چار آدمی مامور کئے گئے تھے۔ زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص، عبداللہ بن الحارث — روایت نمبر ۲، ۳ میں ہے کہ تمام صحابہؓ نے مل کر قرآن جمع کیا اور مختلف مصاحف مرتب کئے۔ روایت نمبر ۴، ۵، ۶ میں ہے کہ دو آدمی زید بن ثابت اور سعید بن العاص اس کام پر مامور ہوئے روایت نمبر ۷ میں ہے کہ ۱۲ صحابہؓ نے یہ کام کیا

۳۔ پہلی روایت کو چھوڑ دیجئے تو باقی روایات سے معلوم ہوگا کہ قرآن کو پہلی مرتبہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع کیا گیا۔

ہم بخوف طوالت ان روایات کے متن کو تنقید کی زد پر نہیں لاتے۔ آپ خود انہیں پڑھ لیجئے، ان کا ضعف واضح ہو جائے گا۔

قدر مشترک

ان تمام روایات میں البتہ ایک چیز قدر مشترک کی سی حیثیت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ عہد عثمانی میں قرأت کے اختلافات پیدا ہو چکے تھے جنہیں مٹانے کے لئے یہ قدم اٹھایا گیا۔

یہ قدر مشترک ہی کیوں ہو؟

بظاہر یہ قدر مشترک نظر آتی ہے کہ اختلافات قرأت پیدا ہو گئے تھے مگر کتب روایات کا یہ خاصہ ہے کہ ان میں مشترک بات رکھی ہی نہیں جاتی۔ جمیع اختلاف میں ہی اگر اشتراک و اتحاد آ جائے تو بات کیا بنے؟ ان لوگوں نے تو ایسا معجون الصنعتیہ[۱] تیار کر رکھا ہے کہ الامان والحفیظ۔ بھانت بھانت کی بولی، قسم قسم کی چوکھٹیں تاکہ آپ کوئی نظریہ قائم نہ کر سکیں۔ ہاں جیسا کچھ چاہیں اس ذخیرہ سے نکال لیں۔ چنانچہ اب یہ نظریہ بھی ختم کیجئے کہ عہد عثمانی میں اختلافات قرأت پیدا ہو چکے تھے۔ اب ایک اور بات سنئے۔

عہد عثمانی میں لفظی اختلافات پیدا ہو گئے تھے

امام ابن ابی داؤد یزید سے نقل کرتے ہیں کہ

"میں ولید بن عقبہ کے زمانہ میں مسجد کے اس حلقہ میں بیٹھا تھا جس میں حضرت حذیفہؓ تشریف فرما تھے۔ مسجد میں اس وقت روکنے والے اور پولیس کے سپاہی نہیں تھے یکایک کسی نے پکار کر کہا کہ جو شخص ابوموسیٰ اشعری کی قرأت پر قرآن پڑھتا ہو وہ اس گوشے میں آ جائے جو ابواب کندہ کے پاس ہے اور جو شخص عبداللہ بن مسعود کی قرأت پر قرآن پڑھتا ہو وہ ادھر اس گوشہ

۱؎ معجون الصنعتیہ ایک ایسا معجون ہے جس میں تقریباً ۲۰۰ دوائیاں پڑتی ہیں اور تمام کی تاثیر ایک دوسرے سے مختلف بیان کی جاتی ہیں۔ اردو میں مجھے اس کا مترادف لفظ نظر نہیں آیا ویسے محاورتاً "چوں چوں کا مربہ" کہہ لیجئے۔ (مترجم)

میں جائے جو عبداللہ کے گھر کی طرف ہے۔ وہاں دو آدمیوں میں سورۂ بقرہ کی آیت پر اختلاف ہوا تھا ایک پڑھتا تھا "فاتموا الحج والعمرۃ للبیت"۔ اور دوسرا پڑھتا تھا۔ "اتموا الحج والعمرۃ للہ" حضرت حذیفہؓ کو غصہ آگیا آنکھیں لال ہوگئیں۔ انہوں نے اپنا کرتہ سمیٹ کر بغل میں کیا اور مسجد میں ہی کھڑے ہو گئے۔ یہ واقعہ حضرت عثمانؓ کے عہد کا ہے اور فرمایا۔ یا امیر المومنین میرے پاس آئیں یا میں ان کے پاس جاکر بتاؤں۔ لوگو! تم سے پہلی امتوں نے بھی یہی کیا تھا۔ پھر آگے بڑھکر بیٹھ گئے اور فرمایا۔ خدا نے محمد صلعم کو مبعوث فرمایا۔ انہوں نے مومنوں کی معیت میں منکروں سے جنگ کی۔ حتیٰ کہ خدا نے اپنے دین کو غالب کر دیا پھر خدا نے انہیں اٹھالیا تو لوگوں نے بے لگام گھوڑے کی طرح ہر طرف دوڑ لگانی شروع کی پھر خدا نے فاروق اعظمؓ کو خلیفہ بنایا تو وہ علی الاتصال پیٹتے پھر خدا نے ان کو بھی اٹھالیا تو لوگوں نے پھر بے تحاشا بے لگام گھوڑے کی طرح دوڑ شروع کی۔ پھر خدا نے عثمانؓ کو خلیفہ بنایا۔ واللہ وہ وقت قریب ہے کہ لوگ اسلام میں ایسی جلد و پیائی کریں جو پچھلی تمام جادہ پیمائیوں کو پیچھے چھوڑ جائے۔" (کتاب المصاحف)

یہاں سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ جسے آپ اب تک زیر زبر کا اختلاف سمجھ رہے تھے وہ لفظی اختلاف تھا۔ نیز ان روایات سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ جب حضرت عثمانؓ قرآن جمع کرنے لگے تو وہی کچھ لکھا گیا جو صحابہؓ نے مختلف چیزوں پر لکھا ہوا کر دیا تھا۔ کیا یہ کہ یہ مکمل قرآن تھا یا اس کی بعض آیات تھیں؟ یہ خلش یقیناً آپ کے دل میں پیدا ہو رہی ہوگی۔ مگر اس کا کوئی جواب اہل روایات کے پاس نہیں بلکہ منافقین عجم کی سازش ہی یہی تھی کہ یہ خلش آپ کے دل میں کھٹکے اور وہ مقصود انہیں حاصل ہوگیا۔

زید بن ثابت کے انتخاب پر عبداللہ بن مسعود کا اظہار ناگواری

جمع قرآن بعہد صدیقؓ اور جمع قرآن بعہد عثمانؓ میں تقریباً تمام روایات میں یہ بات آئی تھی کہ کتابت کا منصب حضرت زیدؓ کو ملا تھا۔ یہ چونکہ قدرے مشترک تھی اس لئے یہ بات گھڑی گئی کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے زیدؓ کے انتخاب پر ناگواری کا اظہار کیا تھا۔ یہ بات زہری کو ہی سوجھی تھی اور انہوں نے ہی یہ کام کیا سنئے۔

"ابن شہاب زہری نے کہا کہ مجھ کو عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ نے بتایا کہ زیدؓ بن ثابت کا کتابت مصحف کے لئے انتخاب حضرت عبداللہ بن مسعود کو ناگوار گزرا تھا۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ مسلمانو! میں تو کتابت مصاحف سے معزول کیا جاؤں اور یہ ذمہ داری ایک معمولی آدمی کے سپرد کی جائے۔ خدا کی قسم میں نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا جب زید اپنے کافر باپ کی پیٹھ میں تھا اور اسی لئے انہوں نے اہل عراق سے کہا۔ اے اہل عراق! تم لوگ اپنے اپنے مصاحف کو مقفل (پوشیدہ) رکھو۔ دیکھو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔" ومن یغلل

ؔ معلوم نہیں خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام کیوں نہیں لیا گیا (سیفی) ؔ اس آیت پر بحث آرہی ہے۔ (سیفی)

یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (۳/۱۶۱) (جو شخص غلول کرے گا تو جس چیز کا غلول کرے گا اسے لئے ہوئے قیامت کے دن آئے گا)۔

پس تم بھی غلول کرو تاکہ اللہ سے ان مصاحف کے ساتھ مصافحہ کرو۔" (ترمذی جلد دوم)

امام ابن ابی داؤد بھی مذکورہ بالا سند کے ساتھ اس روایت کا یہ حصہ نقل کرتے ہیں۔

"اے مسلمانو! مجھے تو مصحف کی کتابت سے الگ رکھا گیا اور یہ ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی کہ جب میں ایمان لیا تو وہ ابھی کافر باپ کی صلب میں تھا۔" (کتاب المصاحف)

امام مذکور آگے چل کر زر بن حبیش سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا۔

"میں نے حضورؐ کی زبان مبارک سے ستر سے زیادہ سورتیں پڑھیں اور زیدؓ بن ثابت بچہ تھا اس کے سر پر دو زلفیں لہرایا کرتی تھیں۔" (کتاب المصاحف) یہی روایت نسائی میں عبش کوفی سے مروی ہے۔

"غلول" والی روایت میں ابن ابی داؤد خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ اپنی سند کے ساتھ لکھتے ہیں۔

"جب حضرت عثمانؓ نے اپنے مرتب کردہ مصاحف کے سوا باقی تمام مصاحف کو پھاڑ ڈالنے کا حکم دیا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا۔ لوگو! اپنے قرآن چھپا لو کیونکہ مَنْ یَغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ○ (جو شخص چھپا کر رکھے گا قیامت کے دن اسے اپنے ساتھ لے کر آئے گا) اور بہتر چھپانے کی چیز قرآن ہے جسے تم میں سے کوئی قیامت کے دن اپنے ساتھ لائے۔" (کتاب المصاحف)

دوسری جگہ امام مذکور شقیق سے نقل کرتے ہیں۔

"حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا۔ مَنْ یَغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ عثمانؓ مجھے کس کی قرأت پڑھنے کا حکم دے رہے ہیں۔ میں نے خود حضورؐ سے ستر سے زیادہ سورتیں پڑھی ہیں۔ اور صحابہ رسولؐ کو علم ہے کہ آج میں ان میں سے کتاب اللہ کا سب سے بڑا عالم ہوں اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا عالم ہے تو میں سفر کر کے بھی اس کے پاس جاتا۔" (کتاب المصاحف)

روایات پرستو! عبداللہ بن مسعود جیسے جلیل القدر صحابی پر تحریف معنوی کا الزام نہ دھرو

غلول کی جس آیت کو روایات میں بار بار دہرایا جاتا ہے اسے قرآن حکیم میں دیکھئے اور پھر سوچئے کہ قرآن کی آیت مقدسہ میں کس طرح تحریف معنوی کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (۳/۱۶۱)۔

کسی نبی کا یہ کام نہیں کہ وہ چھپائے اور جو کوئی چھپائے گا وہ لائے گا اپنی چھپائی ہوئی چیز کو قیامت کے دن۔ پھر ہر آدمی

اپنے عمل کا پورا بدلہ پائے گا۔ اور اس پر زیادتی نہ کی جائے گی۔

تمام ائمہ لغت و تفسیر کا اس بات پر اتفاق ہے کہ غَلَّ یَغُلُّ کے معنی ہیں خیانت کرنا یا خیانت کی نیت سے کسی چیز کو چھپانا۔ آیت خود وضاحت کر رہی ہے کہ غلول کوئی فعل نہیں جو کوئی غلول کرے گا قیامت کے روز اس کی سزا ملے گی۔ اور اس پر زیادتی نہیں کی جائے گی۔ روایت پرستوں میں سے اگر کوئی صاحب اس کے خلاف مطلب لے سکتے ہیں تو لے لیں اور ثابت کر دیں کہ غلول کو خدا نے مستحسن قرار دیا ہے۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ کسی عربی خوان بچے کو سورۂ آل عمران کی مذکورہ غلول والی آیت دے دو اور اس سے مفہوم پوچھ لو وہ یہی کہے گا کہ غلول کی خدا نے مذمت کی ہے۔ جب ایسی بات ہے تو سوچو کہ کیا تمہاری روایات نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے قابل قدر صحابی کو قرآن کی معنوی تحریف کرنے والا نہیں بنا دیا۔ ہائے تمہاری گستاخیوں کی بے باک تلوار ہو صحابہؓ کے نفوس مطہرہ تک بھی پہنچ جاتی ہے۔

صحابہؓ کے باہمی تعلقات

پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ صحابہ کرامؓ جن کی تعریف میں خدائے قدوس کا ارشاد ہے کہ اشداء علی الکفار رحماء بینہم ان کے باہمی تعلقات یہ روایات کس طرح پیش کر رہی ہیں۔ حضرت عبداللہؓ کو کلمات ادا کرتے تھے اور معاذ اللہ ان کے منصب پر حسد کرتے تھے۔

احادیث، دین کی بنیاد کجا دین کی صحیح تاریخ بھی نہیں

ایک انہی روایات پر کیا موقوف ہے۔ احادیث کی کتابیں اٹھا لیجئے اور دیکھئے کہ احادیث نے صحابہؓ کے مقدس دامنوں پر کس قدر کثافت کے چھینٹے پھینکے ہیں۔ اور یہ کچھ عام کتابوں میں نہیں۔ بخاری و مسلم میں ہے۔ وہاں حضرت علیؓ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت صدیقؓ کی بیعت نہ کی اور چھ ماہ تک حضرت فاطمہؓ کو علالت کی حالت میں اونٹنی پر سوار کر کے پھرتے رہے اور کہتے تھے خلافت ہمارا حق تھا۔ ہم سے چھین گیا۔ ہم نعوذ باللہ کے خون سے (معاذ اللہ) وہ ناپاک الزامات یہاں نہیں دہراتے جو احادیث کی کتابوں نے صحابہ کرامؓ پر لگائے ہیں۔ اسی بنا پر ہم کہا کرتے ہیں کہ روایت پرست تو کہتے ہیں کہ حدیث دین کی بنیاد ہے مگر دین کی بنیاد ہونا تو کجا وہ تو دین کی صحیح تاریخ بھی نہیں۔ اس بحث کو بھی ہم تدوین حدیث والے باب میں چھیڑیں گے۔

بہ سیر مطلب

ہم نے عرض کیا تھا کہ تقریباً تمام روایات میں یہ بات قدر مشترک نکلتی ہے کہ عہد صدیقؓ اور عہد عثمانؓ میں زید بن ثابتؓ نے کتابت صحف کا فریضہ سرانجام دیا تھا۔ ابھی ابھی آپ دیکھ چکے کہ اتنا تو کہہ دیا گیا کہ یہ بات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو بہت ناگوار گزری تھی اب ایک اور روایت بھی دیکھ لیجئے جس میں اس کے بالکل برخلاف بیان دیا گیا ہے۔

ابی بن کعب لکھواتے تھے اور لوگ لکھتے تھے

علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔

"حضرت ابی بن کعب فرماتے تھے کہ خلافت ابوبکر صدیقؓ میں لوگ قرآن جمع کرنے لگے۔ مصاحف میں لوگ لکھتے تھے اور میں لکھتا تھا تو جب لوگ سورۂ توبہ

کی آیت ثم انصرفوا صرف اللہ قلوبہم پر پہنچے تو انہوں نے گمان کیا کہ یہ آخری حصہ ہے جو نازل ہوا۔ ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ اس کے بعد مجھے رسولِ خدا صلعم نے دو آیتیں پڑھائی تھیں۔ لقد جاءکم رسول من انفسکم۔ الخ پس یہی قرآن کی آخری آیات ہیں جو نازل ہوئیں۔" (تفسیر ابن کثیر ج ۵، مسند احمد)

لیجئے زیدؓ بن ثابت والی بات بھی ختم ہو گئی لکھانے والے تھے حضرت ابی بن کعب اور لکھنے والے تھے دوسرے لوگ۔ اور وہ جو خزیمہ یا ابن خزیمہ کا جھگڑا تھا وہ بھی طے ہوا کیونکہ سورۃ توبہ کی آخری آیات خود حضرت ابیؓ بن کعب کے پاس تھیں۔

اختلافِ قرأت

متذکرہ روایات میں ایک چیز بہت نمایاں ہو کر آپ کے سامنے آئی ہوگی اور وہ یہ کہ حضرت عثمانؓ نے قرأت کے اختلافات کو مذموم سمجھ کر ختم کیا اور لوگوں کو ایک قرأت کا پابند بنا دیا۔ مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ آج تک علمائے کرام اختلافِ قرأت کے قائل ہیں۔ تفاسیر دیکھئے تو اکثر آپ کو یہ تفاسیر ملیں گی کہ فلاں لفظ کو فلاں نے یوں پڑھا اور فلاں نے یوں۔ بلکہ اب تو ایسے قرآن بھی شائع ہو چکے ہیں جن کے حاشیہ پر لفظ کو دوسری طرح کی قرأت میں لکھا گیا ہے۔ اور آج اگر ان لوگوں کو کہو کہ جب حضرت عثمانؓ نے اتنے اہتمام کے ساتھ اختلافِ قرأت کو ختم کرنے کی سعی کی تھی تو ان کے نزدیک یہ اچھی چیز نہیں ہوگی تو پھر یہ ان روایات کا سہارا لیتے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ قرأت کا اختلاف جائز ہے۔

اور یوں بھی ابھی ہم نے عرض کیا تھا کہ ذخیرہ احادیث بھی دراصل مجموعہ اضداد ہے یہاں ہر بات مل سکتی ہے بس ذرا محنت سے کھنگالنا پڑتا ہے۔ جمع قرآن بعہد عثمانؓ کے ضمن میں ہم نے جن روایات کا تذکرہ کیا ہے ان میں آپ نے یہ چیز ضرور محسوس کی ہوگی کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں قرأت کے اختلافات پیدا ہو گئے تھے انہوں نے اسے برا سمجھا اور ختم کرنے کی جدوجہد کی۔ اب ہم آپ کو وہ حدیث دکھاتے ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ حضور سے حضرت عثمانؓ نے بھی یہ روایت نقل کی ہے کہ قرآن سات قرأتوں پر اترا ہے۔ ابو یعلی الموصلی لکھتے ہیں۔

"حضرت عثمانؓ بن عفان منبر پر کھڑے ہوئے اور خطبہ دیتے ہوئے آپ نے فرمایا میں اس شخص کو قسم دیتا ہوں جس نے حضور صلعم سے یہ حدیث سنی ہے ان ھذا القرآن انزل علی سبعۃ احرف۔ (بے شک یہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔) چنانچہ ہر طرف سے صحابہ کھڑے ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد شمار سے باہر تھی۔ ہر شخص یہی کہتا تھا کہ میں نے حضور کو یہ بات کہتے سنا ہے۔" (مسند کبیر)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اختلافِ قرأت کوئی مذموم چیز نہیں بلکہ حضور صلعم نے ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ نے قرآن نازل ہی سات قرأتوں پر کیا ہے۔ پھر حضرت عثمانؓ کون ہوتے ہیں اختلافِ قرأت کو ختم کرنے والے؟ بات یہیں پر نہیں بلکہ یہ تک کہہ دیا گیا ہے کہ ایسے اختلافات حضورؐ کے زمانۂ اقدس میں بھی موجود تھے اور حضور نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی تھی۔ سنئے۔

مسلم شریف کی روایت

"حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے فرماتے ہیں میں مسجد میں تھا ایک شخص آکر نماز پڑھنے لگا اور ایسی قرأت سے اس نے قرآن پڑھا جو مجھ کو ممنوع

قرأت میں پھر دوسرا شخص آیا تو اس نے پہلے سے مختلف قرأت میں قرآن پڑھا۔ تب حضورؐ نے دونوں کو قرآن پڑھنے کا حکم دیا انہوں نے پڑھا تو حضورؐ نے دونوں کو سراہا۔ اس پر میرے دل میں تکذیب کا ایسا شدید جذبہ پیدا ہوا جو حالت کفر میں بھی نہیں ہوا تھا۔ حضورؐ نے میری حالت کو محسوس کر لیا اور میرے سینے میں ٹھوکا لگایا میں پسینہ پسینہ ہو گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ میں خود خدا کو سامنے دیکھ رہا ہوں پھر آپ نے فرمایا ... اے ابی میرے پاس پیغام بھیجا گیا کہ میں قرآن کو ایک قرأت پر پڑھوں تو میں نے واپس کیا اور درخواست کی کہ میری امت کو سہولت عطا کی جائے۔ دوبارہ حکم آیا کہ میں قرآن کو دو قرأتوں میں پڑھوں۔ میں نے پھر واپس کر دیا اور عرض کیا میری امت کے لئے مزید آسانی ہو تو سہ بارہ حکم آیا کہ قرآن کو سات قرأتوں پر پڑھو اور یہ واپسی پر جو میں نے تمہارے پاس اس کو واپس کیا کوئی ایک چیز مانگنے کا تمہیں حق ہے تو میں نے عرض کیا میری امت کو بخش دے تو حکم ہوا جیسے سوال کو اس دن پر اٹھا رکھا ہے ساری مخلوق حتیٰ کہ ابراہیم علیہ السلام بھی میری طرف راغب ہوں گے۔

(صحیح مسلم جلد اول)

روایت پرستو! خدا سے ڈرو

اس روایت میں جو زہر پھیلایا گیا ہے اس پر غور کیجئے اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں بار بار ارشاد فرماتا ہے کہ میں کسی کو تکلیف مالایطاق نہیں دیتا۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا يُرِيدُ اللّٰهُ۔ مگر معلوم نہیں روایت پرستوں کو کلام اللہ سے عداوت میں کیا لطف آتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ خدا حکم بھیجے اور نبی احکام رد کرے (معاذ اللہ) مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ۔ روایت پرستو اپنی ان روایات کو دیکھو اور پھر سوچو کہ خدا کے متعلق کیا نظریہ قائم ہوتا ہے یا نہیں کہ (معاذ اللہ) اللہ کی ذات اقدس و اعظم کے احکام غیر مآل اندیشانہ ہوتے تھے وہ یونہی بے سوچے سمجھے کوئی حکم دے بیٹھتا تھا۔ اور پھر حضورؐ اس حکم کو واپس کر دیتے تھے تاکہ اللہ اپنے فیصلہ میں ترمیم کرے۔ کبھی تمہاری روایات کہتی ہیں کہ خدا نے ابتداء میں پچاس نمازیں اور چھ ماہ کے روزے فرض کئے تھے اور نبی صلعم بھی یہ بار گراں امت کے لئے لا رہے تھے کہ راستے میں موسیٰ علیہ السلام مل گئے انہوں نے بتایا کہ یہ فیصلہ بڑا بھاری ہے۔ جاؤ واپس جاؤ اور کچھ کمی کراؤ۔ پھر نبی صلعم واپس جاتے رہے اور تھوڑی تھوڑی کمی ہوتی رہی۔[1]

بہرحال آپ نے مسلم شریف کی روایت دیکھی جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابی بن کعب کے دل میں تو تکذیب دین کا شدید جذبہ پیدا ہو گیا تھا مگر حضورؐ کے ٹھوکے سے بچ گئے اس معاملہ میں جانے کیوں ایسے پیچھے رہتے۔ انہوں نے بھی ایک روایت گھڑ دی ہے اور اپنے طور پر ثابت کر دیا ہے کہ حضورؐ کے زمانہ میں بھی قرأت کے شدید اختلافات موجود تھے اور محض لب و لہجہ کے نہیں بلکہ الفاظ کے اختلافات تھے۔ یعنی ایک ہی سورۃ میں ایک صحابی کوئی الفاظ پڑھتا تھا تو دوسرا اسی سورۃ میں کوئی اور الفاظ پڑھتا تھا۔ جیسے مسعود بن مخرمہ اور

[1] ان روایات پر ہم نے مقدمہ تفسیر القرآن کے باب جادو و نسخ میں بالتفصیل بحث کی ہے۔ (سیفی)

عبدالرحمٰن بن عبد قاری کے واسطے سے فاروق اعظمؓ کی یہ روایت بیان ہوئی ہے۔

حضورؐ کے زمانہ میں قرآن کے الفاظ میں اختلاف تھا (معاذاللہ)

حضرت عمرؓ کہتے ہیں میں نے ہشام بن حکیم کو حضورؐ کی زندگی میں سورۂ فرقان پڑھتے سنا تھا وہ بہت سے ایسے الفاظ پڑھ رہے تھے جو مجھے رسول اللہؐ نے نہیں پڑھائے تھے قریب تھا کہ میں نماز میں ہی ان پر حملہ کر بیٹھوں مگر میں نے بمشکل صبر کیا۔ پس جب انہوں نے سلام پھیرا تو میں نے انہی کی چادر میں انہیں کس لیا اور پوچھا یہ سورت جو تم پڑھ رہے تھے تمہیں کس نے پڑھائی؟ انہوں نے کہا مجھے رسول اللہؐ نے پڑھائی تھی۔ میں نے کہا تو جھوٹ بولتا ہے کیونکہ حضورؐ نے مجھے اس سے مختلف پڑھائی ہے۔ اور میں اسے کھینچتا ہوا رسول صلعم کی طرف لے گیا میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں نے اسے سورۂ فرقان ایسے الفاظ میں پڑھتے سنا جو آپ نے مجھے نہیں پڑھائے۔ آپ نے فرمایا۔ انہیں چھوڑ دو۔ ہشام پڑھو۔ چنانچہ ہشام نے اسی طرح رسول اللہؐ کے سامنے پڑھا جیسا میں نے اسے پڑھتے سنا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ یونہی تو نازل ہوئی ہے" پھر فرمایا۔ عمرؓ اب تم پڑھو۔ چنانچہ جس طرح حضورؐ نے مجھے پڑھائی تھی میں نے پڑھ دی تو حضورؐ نے فرمایا "یوں بھی نازل ہوئی ہے" اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ یہ قرآن تو سات حرفوں پر نازل ہوا ہے جس طرح آسان ہو پڑھ لیا کرو۔ (بخاری شریف ج ۲)

یہاں سے معلوم ہوا کہ سات حرفوں والا معاملہ محض لب و لہجہ کے اختلاف پر منحصر نہیں کیونکہ حضرت عمرؓ اور حضرت ہشامؓ دونوں قریشی مکی ہیں دونوں کی زبان ایک ہے لب و لہجہ ایک ہے مگر سورۂ فرقان کو ایسے اختلاف سے پڑھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ان پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں بمشکل اختتام نماز تک صبر ہوتا ہے اور پھر ان کی چادر میں کس کر حضورؐ کے پاس لاتے ہیں لیکن حضورؐ دونوں سے سن کر فرماتے ہیں "یوں بھی نازل ہوئی ہے اور یوں بھی"

سات حرفوں سے کیا مراد ہے؟

معلوم ہوا کہ سات حرفوں سے محض قرأت یعنی لب و لہجہ اور زیر زبر کا اختلاف مراد نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب ہے کہ صحابہؓ کو اجازت تھی کہ وہ مرادف الفاظ استعمال کرتے رہیں یعنی قرآن حکیم کے الفاظ متعین نہ تھے بلکہ مفہوم مختلف الفاظ میں ادا کیا جا سکتا تھا تو قرآن بھی گویا روایت بالمعنیٰ ہے۔ (معاذاللہ) بخاریؒ کے مشہور شارح علامہ عینی اسی روایت کے حاشیہ پر لکھتے ہیں۔

"اس حدیث سے ان لوگوں کے قول کو مزید تقویت ملتی ہے جو کہتے ہیں کہ سات حروف سے مراد مرادف الفاظ ہیں مطالب ادا کرنا ہے خواہ وہ ایک ہی لغت سے کیوں نہ ہوں کیونکہ ہشامؓ اور عمرؓ دونوں قریشی ہیں اور ان کی لغت ایک ہے اور اس کے باوجود دونوں کے پڑھنے میں اختلاف ہو رہا ہے ابن عبدالبر اور اکثر اہل علم یہی کہتے ہیں کہ سات حرف سے یہی مراد ہے" (عمدۃ القاری)

بخاری شریف کی اس روایت نے قرآن حکیم کے خلاف اعدائے دین کو کیا مواد فراہم کیا ہے، اس کا اندازہ ذیل کی عبارت

سے لگایئے۔ پادری الیس۔ این۔ پال بخاری شریف کی محولہ بالا عبارت نقل کر کے کہتا ہے۔

قرآن حکیم پر پادری کا حملہ

مجھے مسلمانوں پر تعجب ہے کہ وہ بار بار کہا کرتے ہیں کہ توریت و انجیل محرف ہیں اور قرآن غیر محرف۔ کیا وہ خود اس قدر جاہل ہیں کہ بخاری کی یہ روایت ان تک نہیں پہنچی یا ہمیں وہ ایسا نادان سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی کتابیں دیکھے بغیر ان کی بات مان لیں۔ یہ روایت اس وضاحت سے محمد صلعم کو (معاذاللہ) جھوٹا ثابت کر دیتی ہے کہ اور کسی چیز کی ضرورت تک نہیں رہتی۔ دیکھئے دونوں آدمی ایک دوسرے کے خلاف قرأت کر رہے ہیں۔ محمد دونوں کی قرأت سننے کے بعد کہتے ہیں یہ بھی ٹھیک ہے اور یہ بھی۔ پہلے سے انہوں نے کیوں نہیں بتایا کہ سورۂ فرقان کے فلاں الفاظ یوں بھی ہیں اور یوں بھی۔ اصل یہ ہے کہ انہیں خود یاد نہ تھا کہ ایک کو کیا پڑھایا ہے اور دوسرے کو کیا؟ اس لئے پہلے سنتے ہیں اور پھر دونوں کی تصدیق کر دیتے ہیں۔ مسلمانو! توریت و انجیل پر طعن دھرنے والو! کبھی موسیٰ اور مسیح کو بھی اس طرح کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اور اگر کوئی کہے کہ ہم اس روایت کو ضعیف کہتے ہیں اس لئے اسے نہیں مانتے تو میں کہوں گا تمہارے امام بخاریؒ تو اسے مانتے تھے نا؟ پھر ان کے متعلق کیا کہو گے؟ (HISTORY OF THE QURAN P. 212)

امام بخاریؒ تو مانتے تھے نا!

پادری نے آپ کے سینوں میں چھپی ہوئی اس کمزوری کو تاک لیا ہے جسے شخصیت پرستی کہتے ہیں اس لئے دکھتی رگ پکڑ کر بیٹھ گیا ہے کہ تم نہیں مانتے نہ مانو، امام بخاریؒ تو اسے مانتے تھے پھر ان کے متعلق کیا کہو گے؟ وہ روایت پرستوں کے قرآن پر حملے کر رہا ہے۔ اور روایت پرستوں سے پوچھ رہا ہے کہ جس امام بخاریؒ نے یہ روایت اپنی کتاب صحیح بخاری میں درج کی ہے اس کے متعلق تمہارا کیا فتویٰ ہے؟ اگر وہ قرآن پر اعتراض کرتا تو ہم اسے دندان شکن جواب دیتے۔ اور وہ ہم سے امام بخاریؒ کے متعلق پوچھتا تو ہم کہہ دیتے ہمیں ان سے کیا سروکار؟ ہم اللہ کے بندے ہیں۔ محمد صلعم کی رسالت پر ایمان لا کر ہم مسلمان ہوئے ہیں۔ انہوں نے قرآن حکیم کتابی شکل میں امت کے حوالہ کیا تھا وہ آج تک محفوظ ہے۔ ہمیں ان ائمہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر انہوں نے اعمال حسنہ کئے ہیں تو وہ ان کے لئے مفید ہیں۔ اگر ان سے غلط اعمال سرزد ہوئے تو ان کا مواخذہ ان سے ہوگا۔ تلک امۃ قد خلت۔

بہرحال یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ روایات کے قرآن میں عہد رسالت میں بھی صحابہؓ کو اختلاف تھا۔ کوئی کچھ پڑھتا تھا کوئی کچھ۔

قرأت میں قرآن کے الفاظ پر زیادتی

قرآن کے اختلافات جو آج بھی شائع ہیں ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن میں قرآن کے الفاظ پر زیادتی کی گئی ہے۔ ہم چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ آیت میں خط کشیدہ حصہ

لہ متعصب پادری کی دریدہ دہنی واقعی قابلِ مذمت ہے۔ مگر اس دریدہ دہنی کی اسے جرأت کیونکر ہوئی؟ اس طویل کتاب میں ایک مقام پر بھی اس نے قرآن حکیم کی آیت پر اپنی گستاخیوں کی بنیاد نہیں رکھی۔ وہ صرف روایات نقل کرتا گیا ہے اور پھر اپنے دل کے عناد سے نتائج نکالے کرتا رہا ہے۔ (ستیفی)

وہ ہے جو صاحب قرأت نے قرآن میں اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔

مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاص کی قرأت میں بروایت سعید بن منصور آیت یوں ہے وَلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ مِّنْ اُمٍّ۔ ابن عباسؓ کی قرأت میں بروایت بخاریؒ آیت یوں ہے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ فِيْ مَوَاسِمِ الْحَجِّ۔ ابن زبیر کی قرأت میں بروایت سعید بن منصور آیت یوں ہے وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيَسْتَعِيْنُوْنَ بِاللّٰهِ عَلٰى مَا اَصَابَهُمْ "

(الاتقان ج اول)

اب ہم اس امر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اگر حضرت عثمان نے مصاحف نقل کرائے تھے تو وہ کتنے تھے اور کس قسم کے تھے؟

مصاحف کی تعداد میں اختلافات

علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں۔

"حضرت عثمان نے دنیائے اسلام کے ہر گوشہ میں جو مصاحف ارسال کئے تھے ان کی تعداد میں اختلاف ہے۔ مشہور قول یہ ہے کہ وہ پانچ مصحف تھے" (الاتقان ج اول)۔

امام ابن ابی داؤد کا بیان ہے۔

"میں نے ابو حاتم سجستانی سے سنا وہ کہتے تھے کل سات مصحف تھے جن میں سے ایک ایک مصحف مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ کو ارسال کیا گیا اور ایک مدینہ میں رکھا گیا" (کتاب المصاحف)

مصاحف کا باہمی اختلاف

کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اختلافات قرأت ختم کرنے کے لئے ایک مصحف لکھوایا اور پھر اس کی نقول مختلف شہروں میں بھیجی گئیں۔ حضرت عثمانؓ نے جو مصحف پہلے لکھوایا تھا اسے امام کہتے تھے۔ چونکہ باقی مصاحف اسی امام کی نقل تھے اس لئے ان کے باہمی اختلاف کا سوال بھی پیدا نہیں ہونا چاہیئے تھا مگر روایات کہتی ہیں کہ ان میں باہم اختلافات تھے۔ ہم مصحف عثمانؓ اور مصحف مدینہ کے چند اختلافات پیش کرتے ہیں۔ یہ اختلافات امام ابن ابی داؤد کی کتاب المصاحف سے نقل کئے گئے ہیں۔

مصحف عثمانؓ	مصحف مدینہ
۱۔ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ۔	۱۔ يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ
۲۔ مِنْ مُّصِيْبَتِهٖ فَمَا كَسَبَتْ۔	۲۔ مِنْ مُّصِيْبَتِهٖ بِمَا كَسَبَتْ
۳۔ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِي الْاَنْفُسُ۔	۳۔ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ
۴۔ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ۔	۴۔ فَاِنَّ اللّٰهَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ

مختلف شہروں میں جو مصاحف بھیجے گئے ان میں باہم اختلاف تھا!

تعجب کی بات یہ ہے کہ جو عثمانؓ اختلافات قرات ختم کرنے کے لئے نقل مصاحف کا اقدام کرتے ہیں وہ مختلف شہروں میں جو مصاحف بھیجتے ہیں ان میں لفظی اختلافات ہیں ہم نہایت اختصار کے ساتھ صرف وہ آیات نقل کرتے ہیں جن میں بہت کچھ لفظی تغیرات ہیں۔

آیت		مصحف	آیت	مصحف
۱۔ وَاَوْصٰی بِهَا اِبْرَاهِیْمُ۔	(۲/۱۳۲)	مدینہ	وَوَصّٰی بِهَا اِبْرَاهِیْمُ۔	کوفہ و بصرہ
۲۔ لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا۔	(۶/۶۳)	مدینہ و بصرہ	لَئِنْ اَنْجَانَا۔	کوفہ
۳۔ قُلْ رَبِّیْ یَعْلَمُ۔	(۲۱/۴)	مدینہ و بصرہ	قَالَ رَبِّیْ یَعْلَمُ۔	کوفہ
۴۔ وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ اِحْسَانًا	(۴۶/۱۵)	کوفہ	وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ حُسْنًا۔	مدینہ و بصرہ
۵۔ هُوَ الَّذِیْ یَنْشُرُکُمْ۔	(۱۰/۲۲)	شام	هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ۔	عراق
۶۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ۔	(۹/۱۰۰)	مکہ	تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهَارُ۔	بصرہ
۷۔ وَالْحَبَّ ذَا الْعَصْفِ۔	(۵۵/۱۲)	شام و حجاز	وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ۔	عراق
۸۔ وَاِذْ اَنْجَاکُمْ۔	(۷/۱۴۱)	شام و حجاز	وَاِذْ اَنْجَیْنٰکُمْ۔	عراق
۹۔ وَلَئِنْ اَنْجَانَا مِنْ هٰذِهٖ۔	(۶/۶۳)	کوفہ	وَلَئِنْ اَنْجَیْتَنَا۔	بصرہ

امام ابن ابی داؤد نے تو ان اختلافات کی بڑی طویل فہرست دی ہے مگر ہم نے محض بطور نمونہ چند اختلاف نقل کئے ہیں۔

ع۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا

قرآن میں غلطیاں رہ گئیں (معاذ اللہ)

یہ تو تھے وہ تغیرات و اختلافات جو مختلف مصاحف میں موجود تھے لیکن کتب روایات کو ابھی تک تسکین نہیں ہوئی۔ وہ یہ بھی کہہ رہی ہیں کہ معاذ اللہ قرآن حکیم میں ایسی غلطیاں بھی سرزد ہو گئیں جو آج تک اسی طرح چلی آتی ہیں۔

عبد الاعلیٰ بن عبد اللہ بن عامر قرشی سے روایت ہے کہ

"جب مصحف لکھ کر لوگوں نے تیار کیا تو جناب عثمانؓ کے پاس لائے آپ نے اسے غور سے دیکھا اور فرمایا تم لوگوں نے نہایت اچھا اور بہت خوب کام کیا مگر اس میں زبان کی کچھ غلطیاں آ گئی ہیں۔ جنہیں اہل عرب اپنی زبانوں سے درست کر لیں گے۔" (کتاب المصاحف لابن ابی داؤد، کنز العمال، الرد علی من خالف مصحف عثمان لابن الانباری)

حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ

"حضرت عثمانؓ نے جب مصحف کو دیکھا تو فرمایا اس میں عربیت کی کچھ خامیاں ہیں۔ اہل عرب انہیں

اپنی زبانوں سے ٹھیک کر لیں گے۔"

(کتاب المصاحف لابن ابی داؤد، الرد علی من خالف مصحف عثمان لابن الانباری)

ابن اشتہ یحییٰ بن یعمر کے طریق سے روایت کرتے ہیں کہ

"حضرت عثمانؓ نے مصحف کو بہ نظر غائر دیکھا اور فرمایا خیر ہو گیا جو ہونا تھا۔ عربیت کی کچھ خامیاں رہ گئی ہیں مگر مجھے اہل عرب پر بھروسہ ہے کہ وہ انہیں اپنی زبان سے درست کر لیں گے" (کتاب المصاحف)

لیجے حضرت عثمانؓ نے اس قدر اہتمام سے اپنے عہد میں قرآن جمع کرایا اور انہیں اپنے مصحف پر اس قدر اعتماد تھا کہ باقی مصاحف کو جلا دینے کا حکم دے دیا مگر اس مصحف میں بھی خامیاں رہ گئیں جو انہوں نے خود محسوس بھی کی تھیں مگر پھر اصلاح نہیں کی اور محض اس لئے کہ یہ غلطیاں اہل عرب اپنی زبان سے ٹھیک کر لیں گے۔ کسی کو تو پوچھنا چاہیئے تھا کہ اہل عجم کیا کریں گے؟ مگر روایات کی دنیا میں عقل و فکر کا استعمال تو جائز ہی نہیں۔ اور آگے پڑھیئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جس سعیدؓ بن عاص کو عربیت کا ماہر اور جس زید بن ثابت کو ماہر کتابت سمجھ کر یہ فریضہ مفوض کیا گیا تھا ان کی غلطیاں دیکھ کر حضرت عثمانؓ پچھتا رہے ہیں۔ سنیئے

امام ابن ابی داؤد اور ابن الانباری عکرمہ سے نقل کرتے ہیں۔

"جب عثمان کے پاس مصحف لایا گیا تو اس میں انہیں کچھ غلطیاں نظر آئیں اس پر انہوں نے فرمایا اگر لکھنے والا بنو ہذیل کا اور لکھوانے والا بنو ثقیف کا ہوتا تو یہ غلطیاں نہ رہ جاتیں۔

(کتاب المصاحف۔ الرد علی من خالف مصحف عثمانی)

ابو عبید اسی روایت کو ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔

"جب مصاحف حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش ہوئے تو ان میں سے کچھ الفاظ غلط پائے گئے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا ان الفاظ کو تبدیل نہ کرو کیونکہ عرب انہیں اپنی زبانوں سے بدل لیں گے۔ یا انہوں نے کہا وہ اپنی زبانوں سے ان کے اعراب درست کر لیں گے۔ ساتھ لکھنے والا قبیلہ ثقیف کا ہوتا اور لکھوانے والا قبیلہ ہذیل کا تو یہ غلطیاں بھی نہ پائی جاتیں" (فضائل القرآن۔ الاتقان ج ۱ ص ۱۸۳۔ الرد علی من خالف مصحف عثمانؓ کتاب المصاحف لابن اشتہ)

دونوں روایتوں کے راوی عکرمہ ہیں مگر پہلی روایت میں ہے کہ لکھنے والا بنو ہذیل میں سے ہوتا اور لکھوانے والا بنو ثقیف میں سے مگر اس روایت میں اس کے بالکل برعکس یہ آیا ہے کہ لکھنے والا بنو ثقیف میں سے ہوتا اور لکھوانے والا بنو ہذیل میں سے۔ مگر ایسے اختلافات تو کتب روایات کا خاصہ ہیں آپ اگر ان کا نوٹس لینے لگے تو "منکر حدیث" کی اصطلاح وضع ہو چکی ہے یہ لیبل فوراً آپ کے سر چپکا دیا جائے گا۔ خیر ان باتوں کو چھوڑیئے اور آگے چلئے۔ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس کے متعلق روایت کرتے ہیں۔

"حضرت ابن عباسؓ نے آیت کریمہ حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا۔ کے بارے میں فرمایا بے شک یہ کاتب کی

غلطی ہے، وہ دراصل حَتّٰی تَسْتَأْذِنُوْا وَتُسَلِّمُوْا ۔ تھا"

(ابن جریر، سنن سعید بن منصور، ابن ابی حاتم)

ابن الانباری نے عکرمہ سے روایت کی ہے کہ

"حضرت ابن عباسؓ نے ایک آیت یوں پڑھی اَفَلَمْ یَتَبَیَّنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَی النَّاسَ جَمِیْعًا ۔ لوگوں نے سنا تو کہا یہ آیت مصحف میں تو یوں لکھی ہے اَفَلَمْ یَاْیْئَسِ الَّذِیْنَ ..... الخ ابن عباس نے جواب دیا "میرا خیال ہے تمہارے کاتب نے یہ آیت لکھی ہوگی تو اونگھ رہا ہوگا"

(الرد علی من خالف مصحف عثمانؓ)

ابن جبیر سے روایت ہے کہ

"حضرت ابن عباس وَقَضٰی رَبُّكَ کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اصل میں وَوَصّٰی رَبُّكَ تھا دوسری واؤ صاد کے ساتھ چپک گئی" (سنن سعید بن منصور ۔ الاتقان)

ابن اشتہ نے یہی روایت نقل کی ہے کہ

"حضرت ابن عباس وَقَضٰی رَبُّكَ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ اصل میں وَوَصّٰی رَبُّكَ تھا۔ کاتب نے سیاہی کا قلم زیادہ لے لیا اور واؤ صاد سے چپک گئی" (کتاب المصاحف ۔ الاتقان)

سعید بن جبیر نے عمرو بن دینار کے طریق پر عکرمہ کی یہ روایت بیان کی ہے کہ

"حضرت ابن عباسؓ پڑھا کرتے تھے وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ ضِیَآءً ۔ (قرآن کے موجودہ نسخوں میں اَلْفُرْقَانَ وَضِیَآءً ہے) اور کہتے تھے کہ تم اس واؤ کو یہاں سے لے کر اس جگہ کر دو۔ وَالَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ ۔ ہے۔ (موجودہ نسخوں میں اس آیت کے شروع میں واؤ نہیں)" (کتاب المصاحف لابن ابی داؤد)۔

اسی روایت کو ابن ابی حاتم نے بھی بیان کیا ہے مگر اس نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "اس واؤ کو یہاں سے اٹھا کر اس آیت میں رکھ دو۔ وَالَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ ۔ (یہ سورہ مومن کی ساتویں آیت ہے۔ موجودہ نسخوں میں اس سے پہلے واؤ نہیں)"

(ابن ابی حاتم)

عطاء کے طریق پر حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت بھی نقل کی گئی ہے کہ

"حضرت ابن عباسؓ مَثَلُ نُوْرِهٖ کَمِشْکٰوۃٍ ۔ کے بارے میں فرماتے تھے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بہت بڑا ہے کہ وہ صاحب ظلمت و جبروت ہے کہ اس کا نور قندیل کی مثل ہو۔ بات صرف یہ تھی کہ اس نے مومن کے نور کو قندیل سے تشبیہ دی تھی گویا آیت تھی مَثَلُ نُوْرِ الْمُؤْمِنِ کَمِشْکٰوۃٍ" (ابن ابی حاتم ۔ کتاب المصاحف لابن اشتہ)۔

ابو معاویہ نے بواسطہ ہشام بن عروہ روایت کی ہے کہ

"عروہ نے کہا میں نے ام المومنین حضرت عائشہؓ صدیقہ سے آیات کریمہ اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ (۲۰/۶۳) وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (۴/۱۶۲) اور اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِـُٔوْنَ (۵/۶۹) کے متعلق پوچھا کہ ان میں کیونکر غلطیاں آگئیں تو انہوں نے فرمایا بھانجے یہ لکھنے والوں کا کام ہے انہوں نے لکھنے میں غلطی کی"۔ (فضائل القرآن لابی عبید۔ کتاب المصاحف لابن ابی داؤد)۔

سیوطیؒ نے یہی روایت نقل کرکے لکھا ہے "اس کی اسناد بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہیں"۔ (الاتقان ج اول)

امام ابن ابی داؤد نے سعید بن جبیر کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہ بھی ان غلطیوں کی نشاندہی کیا کرتے تھے۔

زبیر ابو خالد کہتے ہیں۔

"میں نے ابان بن عثمان سے پوچھا آیہ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (۴/۱۶۲) میں یہ کیا ہجا کہ آگے پیچھے رفع لایا گیا ہے اور المقیمین پر نصب ہے۔ ابان نے جواب دیا یہ کاتب کی غلطی ہے پہلا حصہ لکھ چکا تھا اس نے پوچھا آگے کیا لکھوں۔ لکھنے والے نے کہا کہ المقیمین[1] الصلوٰۃ لکھو۔ اس سے جو کچھ کہا گیا اس نے وہی لکھ دیا"۔ (کتاب المصاحف لابن ابی داؤد)۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ان روایات میں قرآن حکیم کی تین آیات کو غلط بتایا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس غلط فہمی کا ازالہ بروقت کر دیا جائے کہیں کسی دل میں شک و ریب کے کانٹے نہ کھٹکتے رہیں۔ روایات کا تو یہی کام ہے کہ وہ قرآن کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات ڈالا کریں۔ ہم فدایانِ قرآن کا کام یہ ہے کہ ان کے تیروں کو اپنے سینے پر لیں۔ یہ بحث نوافی ہوگی اس لئے دقیق نظر سے مطالعہ کیجئے۔

اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ (۲۰/۶۳) پر یہ اعتراض ہے کہ یہاں اِنَّ کو چاہیئے تھا کہ وہ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ کو منسوب کرتا۔ یعنی آیت یوں ہونی چاہیئے تھی۔ اِنَّ هٰذَيْنِ لَسٰحِرٰنِ۔ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ ـــــ یہ یہ اعتراض ہے کہ جس طرح مؤتون کی حالت فاعلی ہے اسی طرح مقیمون ہونا چاہیئے تھا۔ تیسری آیت پر یہ اعتراض ہے کہ جس طرح اِنَّ کا عمل صابئون پر بھی ہے اس لئے صابئین ہونا چاہیئے۔

ایک لطیف جواب

فرقہ معتزلہ میں امام ابو الہذیل بہت بڑے متکلم ہوئے ہیں۔ خلیفہ مامون الرشید نے اس کے متعلق کہا تھا کہ "ابو الہذیل علم کلام پر اس طرح چھایا ہوا ہے جیسے بادل جانوروں کو اپنے سایہ میں

---

[1] یعنی امراکتب کے بعد المقیمین الصلوٰۃ منصوب ہے کیونکہ یہ اس کا مفعول ہوا (لیثی)

لے لیتا ہے۔ اور فی الواقع ابو الہذیل کا پایہ علم کلام میں بہت بلند ہے۔ ہاں تو انہی ابو الہذیل سے ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ قرآن میں بعض باتیں علم نحو کے خلاف نظر آتی ہیں ایسا کیوں ہے؟ ابو الہذیل نے کہا ایک ایک آیت کا الگ جواب دوں یا ایسا جامع جواب دے دوں جو تمام اعتراضات رفع کر دے۔ سائل نے کہا یہی بہتر ہے کہ کوئی جامع جواب مل جائے۔ ابو الہذیل نے کہا یہ تو آپ مانتے ہوں گے کہ قرآن عربی زبان میں اترا اور اس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو اپنی فصاحت و بلاغت پر نازاں تھے۔ یہ بھی آپ مانتے ہوں گے کہ ان لوگوں نے قرآن کی دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ پس اگر وہ دیکھتے کہ اس میں زبان و بیان کی غلطیاں ہیں تو فوراً اس بات کا اظہار کرتے مگر انہوں نے کہیں ایسا نہ کیا۔ خود قرآن ان کے اعتراضات کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ پس اگر یہ بھی کوئی اعتراض ہوتا تو اس کا ذکر بھی قرآن میں ہونا چاہیے تھا۔ پس جب ماننے والوں نے بھی اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار کے باوجود اسے مانا اور نہ ماننے والے نے بھی اس کی فصاحت و بلاغت پر اعتراض نہ کیا تو ہم کون ہوتے ہیں[1] اعتراض کرنے والے۔ سائل مطمئن ہو گیا۔

اِنْ ہٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ

اس آیت پر اعتراض کی جو روایت گھڑی گئی ہے وہی اس کے بطلان پر دلیل ہے۔ یہ اعتراض حضرت عائشہ صدیقہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ (معاذ اللہ) کیا انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ اِنَّ کا عمل تثنیہ پر اس وقت ساقط ہوتا ہے جب کلام میں انتہائی تاکید مقصود ہو۔ آج بھی فصیح لوگ کہتے ہیں اِنَّ ھٰذانِ رجلان بلکہ یہ تک کہہ دیا جاتا ہے کہ مررت برجلان، جلست بین یداہ، رکبت علاہ حالانکہ عام خیال کے مطابق مررت برجلین، جلست بین یدیہ اور رکبت علیہ آنا چاہیے۔ ہوبر الحارثی کہتا ہے۔ "... تزود منا بین اذناہ" حالانکہ عام خیال کے مطابق یہاں بین اذنیہ آنا چاہیے تھا۔

حق یہ ہے کہ اصل میں یہ طریقہ بنو حارث کا ہے مگر عام عربی میں بھی اس کا استعمال اکثر ہوتا ہے۔ دیکھئے نہیں فرید بک کہتا ہے "فبصفت منہ درھمان" حالانکہ تمہارے قانون کے مطابق درھمین آنا چاہیے تھا۔ اصل یہ ہے کہ یہ اعتراضات ان عجمیوں نے پیدا کئے جنہیں عربی پر پوری طرح عبور نہ تھا۔ اور صرف و نحو کی متداول کتابیں دیکھ کر انہیں کچھ شدبد حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی طرح پر اس کا جواب[2] دیا جا سکتا ہے۔

---

[1] ہندوستان کے عالم شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اپنی کتابوں میں قرآن پر اعتراض کرنے والوں کو بار بار یہی جواب دیا ہے۔ مگر نہ معلوم انہوں نے ابو الہذیل کا نام کہیں نہیں لیا۔ (سیفی)۔

[2] علامہ سیفی نے بہت سے جوابات دئے ہیں لیکن میں انہیں حذف کر رہا ہوں کیونکہ وہ دقیق فنی جوابات ہیں جن کو سمجھنا ہمارے اردو داں طبقے کے لئے مشکل ہے۔ میں نے صرف وہ جوابات اردو میں منتقل کئے ہیں جو نسبتاً آسان ہیں مگر اصل میں یہ ساری بحث علمائے کرام کے لئے مفید ہے۔ (مترجم)

(ا) اِنْ (جو اِنَّ کا مخفف ہے) کا اسم ضمیر شان یہاں محذوف ہے اور ھٰذان لَسٰحران جملہ اسمیہ مبتدا اور خبر سے مل اِنْ کی خبر واقع ہوا ہے۔

(ب) ھٰذان میں ساحران پیدا ان کی مناسبت سے الف لایا گیا ہے جس طرح "سلاسلاً" کو اغلٰلاً اور مِنْ سَبَاٍ کو بِنَبَاٍ کی مناسبت سے تنوین دی گئی ہے۔

وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ یہ اعتراض بھی محض عربی سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ کیونکہ اس کا جواب بھی کئی طرح پر دیا جا سکتا ہے۔ (ا) اصل میں اَمدح کی تقدیر پر منقطوع الی المدح ہے کیونکہ یہ وجہ بلیغ تر ہے۔ خرنق بنت ھفان کا شعر ہے۔

النازلین بکل معترک والطیبون معاقد الازر

اس شعر میں مقیمین و مؤتون کی طرح النازلین کا عطف الطیبون پر ہے۔

(ب) مقیمین قبل پر بھی معطوف ہو سکتا ہے۔ پھر تقدیر عبارت یوں ہو گی کہ مِن قَبْلِ المقیمین۔ چنانچہ لفظ قبل کو حذف کر دیا گیا جو مضاف تھا اور مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام بنا دیا۔ یعنی منصوب بنزع خافض ہے۔

اصل میں یہ عربی ادب کا عام اسلوب ہے قرآن میں ایک اور جگہ پر بھی اسی طرح ہے معلوم نہیں روایت سازوں نے اسے کیوں غلط قرار نہیں دیا۔ دیکھئے بالکل اسی طرح منصوب کا عطف مرفوع پر لایا گیا۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ (۲/۱۷۷) موفون کا عطف صابرین پر ہے حالانکہ روایت کے مطابق یہاں بھی صابرون آنا چاہیئے تھا۔

وَالصَّابِئُوْنَ یہ اعتراض بھی محض بے بنیاد ہے۔ کیونکہ عربی ادب میں یہ اسلوب نیا نہیں۔ اِنَّ عَبْدَاللّٰہِ وَزَیْدٌ قَائِمَانِ عام طور پر کہا جاتا ہے۔ ضابی البرجمی کہتا ہے ع فَاِنِّیْ وَقَیَّارٌ بِھَا لَغَرِیْبٌ — حالانکہ معترضین کے خیال کے مطابق فَاِنِّیْ وَقَیَّارًا آنا چاہیئے تھا۔

یہ تو محض جملہ ہائے معترضہ تھے اب ہم اصل موضوع کی طرف عنان قلم پھیرتے ہیں۔ جمع قرآن بعہد صدیقی اور جمع قرآن بعہد عثمانی رضی کی روایات ہم بڑی تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اور ہم نے یہ بھی اشارہ کیا تھا کہ بعض روایات میں بتایا گیا ہے کہ قرآن حضرت عمرؓ یا حضرت علیؓ نے جمع کیا تھا۔ اول الذکر دو حضرات کے متعلق بہت پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اس لئے سب سے پہلے ہم نے انہی روایات کو بیان کیا ہے اب ہم موخر الذکر حضرات کے متعلق وارد شدہ روایات کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی کچھ روایات پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ انہی پر اکتفا کر لیا جاتا مگر چند دلچسپ روایات سے آپ محروم ہو جائیں گے۔ دلچسپ اس لئے کہ اگر ایسی روایات نہ ہوتیں تو ہمیں کتب روایت میں کھرے کھوٹے کی پرکھ جلد نہ ہو سکتی۔ یہ روایات دراصل لطیفے ہیں اور شاید اسی لئے

گھڑی گئی ہیں کہ پڑھنے والے حفظ کریں۔

قرآن حضرت عمرؓ نے جمع کیا تھا

اس سلسلے میں امام ابن ابی داؤد کی کتاب المصاحف سے ایک روایت ابتداء میں نقل کی جا چکی ہے اب دوسری روایات ملاحظہ فرمائیے۔

"حضرت عمرؓ نے جمع قرآن کا ارادہ فرمایا تو لوگوں کو خطاب کیا کہ جس نے حضورؐ سے کچھ بھی قرآن سیکھا ہو وہ اسے ہمارے پاس لائے لوگوں نے آیات چھال، لکڑی، ہڈی وغیرہ پر لکھ رکھی تھیں پس وہ لے کر آئے۔ کسی سے کوئی چیز قبول نہیں کی جاتی تھی جب تک دو گواہ نہ لئے جائیں۔ پس اس حال میں حضرت عمرؓ شہید کر دئے گئے" (کنز العمال، ابن ابی داؤد، ابن عساکر)

ابھی ابھی آپ نے سنا تھا کہ حضرت عثمانؓ نے لغت قریش میں قرآن لکھنے کا حکم دیا تھا اب حضرت عمرؓ فاروق کا حکم بھی سنئے۔

"حضرت عمرؓ نے جب مصحف جمع کرنے کا ارادہ کیا تو صحابہؓ کی ایک جماعت لکھنے کے لئے بٹھائی اور کہا کہ اس کو لکھو۔ قبیلہ مضر کی زبان میں کیونکہ قرآن ایک مضری شخص پر اترا ہے" (کتاب المصاحف لابن ابی داؤد)

امام ابن ابی داؤد ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مصاحف کو یا تو جوانان قریش لکھیں یا جوانان ثقیف" (کتاب المصاحف فضائل القرآن والی عبید)

حضرت عثمانؓ نے بھی لکھوانے کا کام سعید بن العاص کے سپرد کیا تھا اور لکھنے کا کام حضرت زیدؓ بن ثابت کے سپرد کیا تھا۔ بالکل یہی روایت حضرت عمرؓ کے متعلق ہے۔

"حضرت عمرؓ قرآن جمع کرنے لگے تو انہوں نے صحابہؓ سے پوچھا کہ سب سے زیادہ عربیت کا ماہر کون ہے؟ لوگوں نے کہا سعید بن عاص۔ پھر پوچھا، اچھا لکھنے والا کون ہے؟ لوگوں نے کہا زیدؓ بن ثابت۔ حضرت عمرؓ نے کہا سعید لکھوائیں اور زید لکھیں۔ لوگوں نے چار مصحف لکھے جن میں سے ایک مصحف کوفہ، ایک بصرہ ایک شام بھیجا۔ اور ایک حجاز میں رہا" (کتاب المصاحف لابن الانباری)

زہری کی ایک اور روایت

ابن شہاب زہری کے نام سے تو آپ اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں انہی کی ایک اور روایت سنئے جس میں پچھلی تمام روایتوں کو مات کر دیا گیا ہے۔ ابن الانباری لکھتے ہیں۔

"ابن شہاب زہری سے روایت ہے کہ جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظ قرآن شہید ہوئے۔ جن کی تعداد تقریباً ۴۰۰ تھی تو زیدؓ بن ثابت حضرت عمرؓ سے ملے اور کہا کہ یہی قرآن ہم لوگوں کے دین کا جامع ہے اگر یہ جدا ہو گیا تو ہمارا دین ختم ہو جائے گا اس لئے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ قرآن کو ایک کتاب میں جمع کر لیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا ٹھہر جاؤ۔ ہم ابوبکرؓ سے پوچھ لیں تب دونوں حضرت صدیقؓ کے پاس گئے انہوں نے کہا کہ جلدی نہ کرو ہم مسلمانوں سے مشورہ کر لیں پھر حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا جس میں

اس وقت کی صورت حال اور جمع قرآن کی اہمیت پر تقریر کی۔ لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا۔ تو وہ لوگ قرآن جمع کرنے لگے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ منادی کر دے کہ جس شخص کے پاس قرآن کا کچھ حصہ ہو لائے تو حضرت حفصہؓ نے فرمایا۔ جب تم لوگ حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ الوسطیٰ پر پہنچو تو مجھے اطلاع دینا۔ چنانچہ جب وہ لوگ اس آیت پر پہنچے تو خبر کی۔ حضرت حفصہؓ نے کہا اس کے بعد لکھو۔ "وھی صلوٰۃ العصر" حضرت عمرؓ نے کہا "کیا تمہارے پاس اس کے قرآن ہونے کا کوئی گواہ ہے؟" انہوں نے کہا نہیں۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا "خدا کی قسم! قرآن میں ایسی کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی جس کو صرف ایک عورت بلا گواہ بیان کرے" اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا تحمد واللہ ان الانسان لیخیر وانہ فیہ الی آخر الدہر ۰ ۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ چھوڑو اس بدوؤں جیسی عبارت کو میرے سامنے نہ لاؤ"　　　(کتاب المصاحف لابن الانباری)

دیکھئے یہ روایت ہے تو زہری کی مگر پچھلی تمام روایات کے برخلاف ہے۔ یہاں خود زید بن ثابتؓ جمع قرآن کی تحریک کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد کے تمام واقعات بھی پچھلی روایات کے برعکس ہیں۔ پھر دیکھئے کہ حضرت حفصہؓ کی بات تو حضرت عمرؓ اس بات پر رد کرتے ہیں کہ ان کا کوئی گواہ نہیں تھا لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بغیر گواہ طلب کئے[1] ڈانٹ دیتے ہیں۔

قرآنی حقائق کا بصیرت افروز انسائیکلوپیڈیا

لغات القرآن

چار جلدوں میں

۱۰۰۰ صفحات پر پھیلا ہوا قرآنی الفاظ و معانی کا یہ عظیم الشان سلسلہ قرآن کریم کے پیش کردہ حقائق و لطائف کو سمجھنے اور سمجھانے کے اعتبار سے ایک سنگِ میل اور تاریخی کاوشِ فکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کے ایک ایک لفظ کی تشریح مستند کتب لغات اور خود قرآن کریم سے اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس سے قرآن کی تعلیم اور نظام نکھر اور ابھر کر نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ (جلد اول، دوم، سوم ۲۰ روپیہ فی جلد، چہارم ۱۰ روپے مکمل سیٹ ۷۰ روپے)

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور سے بھی مل سکتی ہے۔

[1] اس امر کو خاص طور پر ذہن میں رکھیے آگے اس کا ذکر آئے گا۔ (سیفی م)

طاؤس و رباب آخر!

(جہاندار شاہ سے محمد شاہ تک)

[ماہنامہ نگار (پاکستان) کی فروری ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں جناب نیاز فتحپوری کے قلم سے ذیل کا مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس پر ہمارا تبصرہ آخر میں ملاحظہ فرمائیے۔ طلوع اسلام]

کس قدر عجیب بات ہے کہ مغلیہ حکومت ڈیڑھ سو سال میں انتہائی عروج تک پہنچی۔ اور ٹھیک اتنی ہی مدت میں وہ زوال پذیر ہو کر ختم ہو گئی۔ یعنی اکبر اعظم سے لے کر وفات اورنگ زیب (۱۵۵۶ء سے ۱۷۰۷ء) تک پورے ڈیڑھ سو سال وہ برابر ترقی کرتی رہی اور اس کے بعد (۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک) اتنی ہی مدت میں اس کی بساط ہمیشہ کے لئے الٹ گئی۔ اس وقت میرا مقصود مغلیہ عروج و زوال کی تاریخ پیش کرنا نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ اسباب زوال کیا تھے؟ اور ان کا آغاز کب ہوا۔ اورنگ زیب کے انتقال (۱۷۰۷ء) کے بعد سے محمد شاہ کی تخت نشینی (۱۷۱۹ء) تک حکومت مغلیہ سخت انتشار و اضطراب میں مبتلا رہی۔ شاہزادوں کی باہمی خوں ریزیاں، دربار کی سازشیں، سید برادران کا مستبدانہ اقتدار، ایسٹ انڈیا کمپنی کی چالیں، مرہٹوں کا زور، ان سب نے مل کر بارہ سال کے اندر حکومت آل تیمور کی چولیں ہلا دیں۔ خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہ تھی کہ اس کا مداوا نہ ہو سکتا۔ لیکن بدقسمتی سے ہوا یہ کہ اسی زمانے میں "طاؤس و رباب" کا بھی دخل دربار میں ہو گیا۔ اور حکومت کے ساتھ عقل و ہوش کا بھی سودا ہو گیا۔ اورنگ زیب کے بعد اس کا بیٹا محمد معظم (بہادر شاہ) تخت نشین ہوا اور پانچ سال تک سخت آپا دھاپی میں مبتلا رہا۔ ظاہر ہے کہ اس دور اضطراب میں عیش و عشرت کا سوال کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ جب اس کا بیٹا جہاندار تخت نشین ہوا تو اس نے انحطاط عمر کے باوجود صرف ۹ ماہ کی حکومت میں اورنگ زیب کی تمام روایات زہد و تقویٰ کو یک لخت خاک میں ملا دیا۔ اور بادہ نوشی و شاہد پرستی کی وہ روایات اپنے بعد چھوڑ گیا جن کو سن کر حیرت ہوتی ہے۔

جس حد تک حکومت کے نظم و انصرام کا تعلق تھا وہ تو اس نے اپنے وزیر ذوالفقار خاں کے سپرد کر دیا اور جس حد تک اس کی ذات، اس کے دربار اور اس کے مشاغلِ زندگی کا تعلق تھا وہ صرف لال کنور کی آغوش تک محدود تھے۔ یا ان مجالسِ بادہ نوشی تک جو اس کی غایتِ زندگی ہو کر رہ گئے تھے۔ لال کنور ایک کسبی کی لڑکی تھی۔ بڑی خوش رو، بڑی خوش گلو اور حد درجہ چنچل۔ جس کا تعارف اس کی ماں شیریں لقا کے نام سے کیا کرتی تھی۔ لال کنور کا گھر مرکز تھا تمام شہزادوں اور امرازادوں کا۔ اور لال کنور کے مصنوعی التفات نے سبھی کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ لیکن اس کی ماں کا مقصود تو ایسا شکار ڈھونڈھنا تھا جو سب سے زیادہ فربہ نظر آئے۔ اس لئے ان تماش بینوں میں اس نے جہاں بخت کا انتخاب کیا، جو جہاندار شاہ کا ماموں زاد بھائی بھی تھا اور فی الجملہ طرحدار بھی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ دوسرے عشاق کو جواب دے دیا گیا اور لال کنور جہاں بخت کی مستقل داشتہ ہو گئی۔ اس کے بعد جہاندار شاہ نے لال کنور کے حسن و جمال کا ذکر سنا تو وہ غائبانہ عاشق ہو گیا۔ اور اس کے حواریین نے لال کنور کی ماں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ وہ اس زریں موقع کو کیوں ہاتھ سے جانے دیتی اس لئے اس نے ایک کثیر رقم پر سودا کر لیا اور لال کنور ایک رات خفیہ طور پر محل کے اندر پہنچا دی گئی۔ جہاں بخت بھی معمولاً رات ہی کو آیا کرتا تھا اس نے اسے آتے ہی پوچھا کہ لال کنور کہاں ہے۔ اس کی ماں جس نے پہلے ہی سے سب تدابیر پر غور کر لیا تھا حد درجہ سوگوارانہ انداز میں زار و قطار روتے ہوئے کہا کہ "وہ تو کل ہی دردِ قولنج میں مبتلا ہو کر دفعتاً مر گئی اور شاہ نظام الدین میں دفن کر دی گئی۔" جہاں بخت جسے پہلے ہی تمام حالات معلوم ہو چکے تھے بپھر گیا اور بولا کہ "تو جھوٹ بولتی ہے۔ لال کنور کو تو نے محل پر بھیج دیا ہے اور مجھ سے یوں باتیں بناتی ہے؟"

اس نے قسمیں کھانا شروع کیں۔ اور جہاں بخت کا غصہ بھی اسی نسبت سے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے پیش قبض نکال کر اسے قتل کر دیا۔ یہ بات ایسی نہ تھی کہ چھپی رہتی۔ آناً فاناً شہر کے کونہ کونہ میں خبر پہنچ گئی اور لال کنور نے رو رو کے برا حال کر لیا۔ جہاندار شاہ کو صدمہ لال کنور کی ماں کے قتل ہونے کا نہ تھا بلکہ صرف اس بات کا کہ وہ لال کنور کو سوگوار نہ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ خود بے دست و پا تھا اور ذوالفقار خاں وزیر یا اس کا قابو نہ تھا۔ اس لئے جہاں بخت کے خلاف قانونی چارہ جوئی یا گیر و دار مناسب نہ سمجھی۔ لیکن چند دن بعد جہاں بخت کو بھلاوے میں ڈال کر زہر سے ہلاک کرا دیا۔ اس کے بعد جہاندار شاہ کی زندگی کا مشغلہ اس کے سوا کچھ نہ رہا کہ وہ ہر وقت نشۂ شراب میں بدمست لال کنور کی آغوش میں پڑا رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دربار پر ڈوم ڈھاری چھا گئے اور لال کنور کے اعزہ کا عروج شروع ہوا یہاں تک کہ اسے امتیاز محل کے لقب سے سرفراز کیا گیا اور اس کے ایک بھائی خوشحال خاں کو ہفت ہزاری امیر بنا دیا گیا اور دوسرے بھائی کو پنج ہزاری۔ لال کنور کے اقتدار و عروج کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے کیا جا سکتا ہے جسے مصنف تذکرۂ عالم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ایک دن جہاندار شاہ اپنا سر شیریں لقا کے زانو پر رکھے پڑا تھا۔ اس کی جوانی کی سرخی، شراب ارغوانی کی جھلک، چاروں طرف پھولوں کے ڈھیر، عطر کی لپٹیں! اسی عالم سرور و نشاط میں شیریں لقا نے جہاندار شاہ سے عرض کیا کہ یوں تو جہاں پناہ کی تمام نوازشیں مجھے حاصل ہیں لیکن دو وعدے اب تک پورے نہیں ہوئے۔ بادشاہ نے پوچھا وہ وعدے کیا ہیں مجھے بتا دیں ابھی ان کو پورا کر دوں گا۔ اس نے کہا ایک وعدہ تو یہ تھا کہ شاہی سکہ میں میرا نام درج کیا جائے گا۔ اور دوسرا یہ کہ تمام شہزادوں کی آنکھیں نکلوا لی جائیں گی۔ یہ سن کر جہاندار شاہ نے اسی وقت جلاد کو بلایا اور راتوں رات شاہزادوں کی آنکھیں نکلوا دیں۔ جہاندار شاہ کی گیارہ بیگمیں تھیں، لیکن انہی میں ایک شریف راجپوتنی بھی تھی، سردار جے سنگھ کی بیٹی، جو پہلے نائب خزانچی تھا اور پھر پنج ہزاری امیر ہو گیا تھا۔ اس بیگم کا نام انوپ بائی تھا۔ اور لقب فخر النساء۔ چونکہ یہ ایک شریف خاندان کی لڑکی تھی اور اسے شیریں لقا کی بے حیائیاں پسند نہ تھیں۔ اس لئے ایک رات اس نے جہاندار شاہ اور اس کی محبوبہ پر دھاوا بول دیا اور ٹھیک اس وقت جب دونوں نشہ شراب میں سرشار تھے تلوار کھینچ کر ان کے سروں پر پہنچ گئی۔ جہاندار شاہ گھبرا گیا اور پوچھا کیا قصہ ہے اس نے کہا قصہ صرف یہ ہے کہ آپ اس کسبی کو محل سے نکال دیں ورنہ میں اسے زندہ نہ چھوڑوں گی بادشاہ نے ڈر سے وعدہ کر لیا۔ لیکن انوپ بائی نے کہا کہ آپ کے وعدہ کا اعتبار نہیں۔ مجھے تو اس کی ناک کاٹ کر اتنا بدصورت بنا دینا ہے کہ آپ اس کی طرف مائل ہی نہ ہوں۔ جہاندار شاہ نے کہا کہ میں یہ ہرگز نہ ہونے دوں گا۔ لیکن انوپ بائی تہیہ کر چکی تھی۔ اس لئے اس نے آگے بڑھ کر لال کنور کی چوٹی پکڑ لی اور اسے زمین پر گرا کر اس کی ناک کاٹ لی۔ ظاہر ہے کہ اس واقعہ کے بعد انوپ بائی محل میں نہ رہ سکتی تھی۔ اس لئے محل سے نکل کر اپنے باپ جے سنگھ کے پاس پہنچی اور اس سے سارا واقعہ بیان کیا۔ اس کے بعد دونوں فرخ سیر کے پاس چلے گئے۔ جہاندار شاہ کی ایک اور بیگم مہر النساء بھی تھی۔ یہ ایک لونڈی تھی کرد نسل کی جسے دس ہزار میں خریدا گیا تھا۔ ایک دن اپنی دادی کی دعوت میں وہ کھانا کھا رہا تھا اور یہ کنیز مورچھل جھل رہی تھی کہ دفعتاً جہاندار شاہ کی نگاہ اس پر پڑ گئی اور کھانے کے بعد ہی محافہ میں سوار کرا کے محل میں پہنچا دی گئی۔ چونکہ کرد خاندان کی لڑکی تھی اس لیے جہاندار شاہ کے اطوار دیکھ کر اس سے بدظن ہو گئی۔ اور اس نے ذوالفقار خاں وزیر سے ساز باز کر کے جہاندار شاہ کو معزول کرا دینا چاہا۔ اتفاق سے اس کا علم جہاندار شاہ کو بھی ہو گیا۔ اس نے جلاد کو حکم دیا کہ اس کا سر کاٹ کر پیش کیا جائے۔ لیکن جب جلاد اس کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ پہلے ہی اپنے گلے میں رسی ڈال کر ختم ہو چکی ہے۔

یہ تھا رنگ جہاندار شاہ کی حکومت کا جس نے سب سے پہلے اپنے مغلیہ خاندان میں شراب خوری اور عیاشی کو رائج کیا اور صرف ۹ مہینے حکومت کرنے کے بعد اپنے بھتیجے فرخ سیر کے ہاتھ سے وہ قتل ہوا۔ جہاندار شاہ کی رنگ رلیوں کی داستان آپ سن چکے لیکن یہ بدعت اس کے بعد بھی بدستور جاری رہی۔ اور بڑھتے بڑھتے محمد شاہ

کے زمانہ میں انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ جب جہاندار شاہ کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا فرخ سیر تخت نشین ہوا تو ملک کی اندرونی حالت بہت خراب تھی اور تمام وہ فتنے جو اس سے پہلے رونما ہو چکے تھے پورے شباب پر پہنچ گئے تھے امراء کی باہمی رقابت و سازش، سکھوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار، سید برادران کی چالیں، یہ سب مل کر حکومت کو تباہ کرنے جا رہی تھیں۔ لیکن فرخ سیر کو مطلق اس کا احساس نہ تھا۔ جہاندار نے جس انداز زندگی کا آغاز کیا تھا وہی بدستور عہد فرخ سیر میں بھی جاری رہی اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ وہ ۳۰ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ چھ سال ۴ ماہ حکومت کی۔ اور فروری ۱۷۱۹ء میں سید حسین علی خاں نے اسے قتل کر دیا۔ اس دردناک واقعہ کا ذکر حقی نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ "جب شہر میں وزیر قطب الملک کے قتل کی خبر مشہور ہوئی تو سید حسین علی خاں نے فیصلہ کر لیا کہ اب فرخ سیر کو ختم ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ نجم الدین خاں (قطب الملک کا بھائی) بہ جبر محل شاہی میں داخل ہوا اور عورتوں کو مار پیٹ کر معلوم کیا کہ بادشاہ کہاں چھپا ہے۔ اس وقت محل میں کہرام بپا تھا۔ عورتیں زار زار رو رہی تھیں، سینہ کوٹ رہی تھیں، لیکن سننے والا کوئی نہ تھا۔ بادشاہ کو پکڑ کر حجرہ سے باہر لے آئے اور اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں اور اس کے بعد تری پولیہ کی ایک تنگ کوٹھڑی میں اسے قید کر دیا اور گردن میں تسمہ ڈال کر نہایت بے دردی سے گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا۔ فرخ سیر کے زمانے میں ملک جس اضطراب و انتشار کا شکار تھا اس کی داستان بہت طویل ہے۔ لیکن اس وقت ہمارا مقصود اس عہد کے تاریخی و سیاسی حالات پر روشنی ڈالنا نہیں ہے۔ اس لئے اس سے قطع نظر صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ رندی و عیاشی کی وہ زندگی جس کا آغاز جہاندار شاہ نے کیا تھا فرخ سیر کا بھی معمول رہی۔ اور آخر کار شاید شراب کی ہلاکت نے اس کی بھی جان لی۔ فرخ سیر کی بھی کئی بیگمیں تھیں۔ (۱) شانتی کماری، راجہ اجیت سنگھ والئی مارواڑ کی بیٹی جسے گیتی آرا بیگم کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ یہ شادی خود راجہ کی تحریک و خواہش کا نتیجہ تھی کیونکہ اس طرح وہ فرخ سیر کو خوش کر کے اپنے رجواڑے کا وہ حصہ جو حکومت دہلی میں شامل ہو گیا تھا واپس لینا چاہتا تھا اور وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا۔ اس شادی میں فرخ سیر نے بے دریغ دولت صرف کی جس کا حکومت کے مالیات پر بہت برا اثر پڑا۔ اور عبداللہ خاں کی گرفت زیادہ مضبوط ہو گئی۔ لیکن خود شانتی کماری اپنی جگہ بڑی باعزت اور ہوش و گوش والی عورت تھی۔ اس کے ساتھ وہ غیر معمولی حسین بھی تھی۔ سنسکرت اور ہندی ادبیات پر بھی اسے بڑا عبور تھا۔ اور اسی حد تک شجاع و دلیر بھی تھی۔ شادی کے بعد فرخ سیر اس کا غلام ہو گیا اور اس کے عشق میں ساری دنیا کو بھول کر مے خواری اس کا شب و روز کا مشغلہ ہو گیا۔ شانتی کماری نے بہت کوشش کی کہ وہ لہو و لعب اور رقص و سرود سے ہٹ کر امور سلطنت کی طرف بھی متوجہ ہو۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی اور سید برادران کا اقتدار برابر بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن جب کہ وہ نشہ شراب میں بدمست تھا انہوں نے محل کو گھیر لیا اور مقابلہ شروع ہوا۔ فرخ سیر کو کیا ہوش تھا کہ وہ سامنے آتا۔

لیکن شانتی کماری نے البتہ ڈٹ کر مقابلہ کیا اور فرخ سیر پہ نثار ہوگئی۔ (۲) احمد النساء بیگم۔ یہ عبداللہ خاں کی بھانجی تھی۔ اور بڑی شائستہ اطوار خاتون تھی۔ عبداللہ خان نے یہ شادی اس لئے کر دی تھی کہ ممکن ہے بادشاہ سنبھل جائے اور اس کے مشاغل لہو و لعب کم ہو جائیں، لیکن یہاں تو ادبار کا بھوت سر پہ سوار تھا۔ احمد النساء بیگم جتنا سمجھاتی وہ اتنی ہی اس کی مخالفت کرتا۔ یہاں تک کہ وہ اس سے بیزار ہوگیا اور عبداللہ خان کو کہلا بھیجا کہ وہ اپنی بھانجی کو بلا لے ورنہ میں اس کو قتل کر دوں گا۔ اس کے ساتھ اس نے احمد النساء بیگم کو محل سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ اور اس نے اس بے عزتی کو گوارا نہ کر کے خودکشی کر لی۔ (۳) گوہر۔ یہ ایک معمولی سپاہی عظمت خاں کی بیوی تھی، جس کو دیکھ کر فرخ سیر فریفتہ ہوگیا۔ اور عظمت خان کو حکم دیا کہ اسے طلاق دے دے۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بادشاہ کے حکم سے سرتابی بجائے خود ایک بڑا جرم تھا۔ اس لئے اس کو بند کر دیا گیا۔ اور گوہر کو بہ جبر محل میں داخل کر دیا گیا۔ اس واقعہ سے جب بدنامی زیادہ بڑھی تو عبداللہ خان کی سفارش پہ عظمت خاں کو تو چھوڑ دیا لیکن اس کی بیوی بدستور محل کے اندر ہی رہی اور اس وقت تک اپنے اصل شوہر سے وصل نہ سکی جب تک فرخ سیر قتل نہیں ہوگیا۔

(۴) فرخ سیر کی وہ بیگم جس نے اسے بالکل تباہ کر دیا۔ یہ ایک بازاری عورت تھی جو غیر معمولی حسین ہونے کے علاوہ رقص و نغمہ کی بھی بڑی ماہر تھی۔ بڑے بڑے امراء کے ہاں اس کا ناچ مجرا ہوا کرتا تھا۔ فرخ سیر کو جب اس کا علم ہوا تو محل میں طلب کیا اور کئی دن تک شراب میں مست ناچ رنگ دیکھتا رہا۔ فرخ سیر نے اس سے محل میں آکر رہنے کو کہا اس نے انکار کر دیا۔ اور بولی کہ میں کسی کی پابند ہو کر نہیں رہ سکتی۔ لیکن یوں جب بھی مجھے یاد کیا جائے گا، حاضر ہو جاؤں گی۔ اس طرح محل میں اس کا آنا جانا شروع ہوا اور فرخ سیر کی فریفتگی بڑھتی رہی۔ اس عورت کا منظور نظر ایک حبشی غلام تھا جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک دن بادشاہ نے عالم سرمستی میں اپنا نو لکھا ہار اس غلام کو دے دیا لیکن جب وہ اسے فروخت کرنے کے لئے بازار گیا تو پکڑا گیا اور اس کسبی کی گرفتاری کا حکم کوتوال نے دے دیا۔ یہ گھبرا کر محل میں آگئی اور ایک مہینے تک یہیں رہی۔ بادشاہ نے حبشی غلام کو بھی رہا کرا دیا اور وہ بھی محل میں آنے جانے لگا۔ ایک رات جب کہ بادشاہ غافل و مدہوش تھا وہ اپنے غلام کے ساتھ محل سے بھاگ گئی۔ اور پھر پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں غائب ہوگئی۔ بادشاہ کو اس کی مفارقت کا اتنا صدمہ ہوا کہ کھانا پینا ترک کر دیا لیکن چند دن بعد پھر وہی رنگ رلیاں شروع ہوگئیں۔ فرخ سیر کے بعد سید برادران نے دو شہزادے یکے بعد دیگرے تخت نشین کئے۔ لیکن یہ تخت نشینی برائے نام تھی۔ سارا اختیار سید برادران کے ہاتھ میں تھا۔ ان میں ایک شہزادے کا نام رفیع الدرجات تھا۔ دوسرے کا نام رفیع الدولہ۔ رفیع الدرجات بہادر شاہ کا پوتا تھا۔ اور تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۲۰ سال کی تھی۔ لیکن حرم کی عیاشانہ زندگی اور کثرت مے خواری کی وجہ سے وہ عرصہ سے سل کے مرض میں مبتلا چلا آرہا تھا۔ اس لئے تخت نشینی کے چار ماہ بعد ہی اس کا انتقال

ہوگیا اور اس کا چھوٹا بھائی رفیع الدولہ جانشین ہوا اور تین ماہ بعد پندرہ سال کی عمر میں یہ بھی مر گیا۔ یہ حضرت ۱۲ سال کے بھی نہ تھے کہ سات آٹھ بیگموں کے شوہر ہو چکے تھے۔ جن میں سرہندی بیگم اور فتحپوری بیگم بھی تھیں۔ فتحپوری بیگم سے عالم شیرخوارگی میں شادی ہو چکی تھی۔ اور سرہندی بیگم سے بارہ سال کی عمر میں۔ اس کا مشغلۂ زندگی بھی میخواری اور رقص و سرود کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس کے بعد محمد شاہ تخت نشین ہوا۔ وہی محمد شاہ جس کے زمانہ میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو تاراج کیا۔ جس نے ۳۰ سال حکومت کی اور اتنا ہی کھول کر داد عیش دی کہ رنگیلے کے لقب سے مشہور ہوگیا۔ اس سے پہلے یہ دستور تھا کہ جب کوئی تاجر دہلی آتا تو بادشاہ کے حضور میں اشرفیوں کی نذر پیش کرتا۔ لیکن محمد شاہ کے عہد میں اشرفیوں کی جگہ خوبصورت لونڈیاں پیش ہونے لگیں۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں ایک تاجر آیا اور کسی گوجر کی ایک لڑکی اپنے ساتھ لایا جس کے حسن کی سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔ بادشاہ نے دیکھا تو وہ اس قدر فریفتہ ہوئے کہ ایک لاکھ اشرفی میں اسے مول لے لیا۔ اور ساری دنیا کو بھول گئے۔ اس لڑکی کا اقتدار اتنا بڑھا کہ ممکن نہ تھا کہ کوئی فرمائش کرے اور پوری نہ ہو۔ ایک مرتبہ اس نے گرمی کے زمانے میں لال قلعہ سے قطب صاحب جانے کا فیصلہ کیا تو یہاں سے وہاں تک دو رویہ خس کی ٹٹیاں لگائی گئیں۔ فوارے نصب کئے گئے۔ رومی مخمل کا فرش بچھایا گیا۔ اور عطر کا چھڑکاؤ ہوا جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ محمد شاہ کس درجہ عیش پسند انسان تھا اور مسلسل ۳۰ سال تک اس نے کتنی دولت ان عیاشیوں میں صرف کی ہوگی۔

طلوع اسلام

یہ مختصر سا مضمون بڑا معلومات افزا اور عبرت انگیز ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک نکتہ ایسا ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ارباب اقتدار کی عیش پرستیاں حکومتوں کے زوال کا باعث ہوتی ہیں لیکن کسی سلطنت کے زوال اور سقوط کا یہی واحد سبب نہیں ہوتا بلکہ یہ بنیادی سبب بھی نہیں ہوتا۔ سلطنت کی بقا اور فنا کا بنیادی طور پر دار و مدار اس نظام پر ہوتا ہے جس کے مطابق وہ سلطنت قائم ہوتی اور اپنا کاروبار چلاتی ہے۔ اگر وہ نظام باطل کی بنیادوں پر استوار ہے تو وہ سلطنت کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔ خواہ اس کے چلانے والے ذاتی طور پر کتنے ہی نیکوکار اور پاکباز کیوں نہ ہوں۔ دنیا میں بدترین نظامِ حکومت، ملوکیت ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ ملوکیت کے معنی یہ ہیں کہ ایک انسان (یا دورِ حاضرہ میں پیکر کی تبدیلی سے انسانوں کی کوئی جماعت) دوسرے انسانوں پر اپنا حکم چلائے اور پھر یہ اقتدار بغیر جو ہر ذاتی کے آگے منتقل ہوتا چلا جائے۔ ملوکیت کے نظام کی بنیاد میں (بقول غالب) خرابی کی صورت مضمر ہوتی

ہے جو اسے تباہی سے بچا نہیں سکتی۔ تاریخِ تہذیب کا مشہور مؤرخ۔ بریفا (BRIFFAULT) اپنی کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) میں سلطنت روما کے زوال پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے

> انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس نظام باطل کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے اس کی بنیادی کمزوری خارجی نظم و ضبط اور اِدھر اُدھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت، عام انسانوں کی لوٹ کھسوٹ سے ایک خاص جماعت کو متمول بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے سوداگری کو نہایت قابلیت اور تدبر۔ خلوص اور دیانتداری سے چلایا۔ لیکن حسنِ انتظام کی یہ تمام خوبیاں بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا رو رعایت نتیجہ خیز ہو کر رہے۔ (ص۱۵۹)

ہماری کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ ہم اپنی تاریخ میں نظامِ تمدن و معیشت و سیاست کو نہیں دیکھتے اور پرکھتے۔ بلکہ ہماری نگاہیں افراد تک پہنچ کر رُک جاتی ہیں۔ اگر کوئی بادشاہ نمازی اور پرہیزگار ہے تو ہم اس کی حکومت کی تعریف کرنے لگ جاتے ہیں۔ اگر اس میں ذاتی خرابیاں ہیں تو ہم اس کی سلطنت کو ہدفِ طعن و تشنیع قرار دے دیتے ہیں۔ حالانکہ باطل کی بنیادوں پر متفرع نظام کبھی مستحق تبریک و ستائش نہیں ہو سکتا خواہ اس کے ارباب حل و عقد ذاتی طور پر کتنے ہی نیک اور پاکباز کیوں نہ ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اربابِ حکومت کا ذاتی کیریکٹر بڑا بلند ہونا چاہیئے لیکن ان کی ذاتی نیکیاں، باطل کے نظام کی خرابیوں کا کفارہ نہیں بن سکتیں۔ سلطنتِ مغلیہ کی تباہی کا باعث اورنگ زیب کے بعد کے حکمرانوں کی عیش سامانیاں ہی نہ تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ خود ملوکیت کی بنیادی خرابی تھی۔ اس سے پہلے حکمرانوں کے حسنِ تدبر نے اسے سہارا دے رکھا لیکن ملوکیت کی خرابیوں کا وزن بڑھتا چلا گیا اور بالآخر یہ عمارت خود اپنے بوجھ سے نیچے آگری۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ (مثلاً) اورنگ زیب نے اپنی تختنشینی کے بعد جو کچھ کیا تھا اس سے اس سلطنت کی تباہی کے اسباب میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اور کیا اس کا تقویٰ ذرہ برابر ان خرابیوں کا کفارہ بن سکتا تھا؟ اس کے زمانہ ہی میں عمارت گر رہی تھی۔ اس کے جانشینوں کی عیش پرستیوں نے، یوں کہیے کہ اس کی مدتِ حیات کو ختم کرنے میں ذرا جلدی کر دی۔ اور اصل تو یہ ہے کہ ذرا گہرائی میں جانے سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ان کے کیریکٹر کی یہ خرابیاں بھی بیشتر اسی نظامِ ملوکیت کی پیدا کردہ تھیں۔ قرآن کریم نے کسی نظام کے بقا اور دوام کے لئے ایک ہی اصول بتایا ہے اور وہ یہ کہ ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (۱۳/۱۷)۔ جو نظام عالم انسانیت کے لئے نفع بخش ہو گا اسی میں باقی رہنے کی صلاحیت ہو گی۔ لہٰذا "انفع للناس" نظام اور اس نظام کے چلانے والوں کا حُسنِ کردار دونوں مل کر مملکت کی بقا کا موجب بنتے ہیں۔

رابطۂ باہمی

اراکین بزم ہائے طلوع اسلام کی خدمت میں۔

رفیقانِ گرامی قدر۔ سلام و رحمت۔

سال بھر سے اپریل کے موسم بہار کا انتظار رہتا ہے کہ اس میں ـــــ آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک لیکن اس دفعہ بعض وجوہات کی بنا پر (جن کا ذکر طلوع اسلام میں آچکا ہے) ہمارا یہ اجتماع اپریل کی بجائے اکتوبر پہ ملتوی ہوگیا۔ اور یوں آپ احباب سے ملنے کا وقفہ بڑھ گیا۔ لیکن اگر بالمشافہ باتیں کرنے میں کچھ توقف ہوگیا ہے تو بین دوران میں طلوع اسلام کی وساطت سے کچھ باتیں کیوں نہ کرلی جائیں۔ میں اسی مقصد سے اس وقت آپ احباب سے مخاطب ہورہا ہوں۔

۲۔ عزیزانِ من! آپ نے قرآنی آواز کے پھیلانے میں جس ذوق و شوق اور تن دہی اور جانفشانی سے کام لیا ہے اس کا (بحمد اللہ) یہ نتیجہ ہے کہ ہماری کم مائیگی اور بے سروسامانی کے باوجود یہ آواز آج پاکستان کے گوشے گوشے تک ہی نہیں پہنچ رہی بلکہ بیرونِ پاکستان اکثر ممالک میں بھی اس کا چرچا ہوتا جارہا ہے اور فضا، قرآنی فکر سے معمور نظر آتی ہے۔ آپ کی یہ کوششیں اپنی جگہ پر درخورِ تحسین ہیں لیکن میں آپ کی توجہ ایک اور اہم نقطہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ قرآن کریم کی اس تعلیم نے خود ہمارے اندر کس قدر تبدیلی پیدا کی ہے اس لئے کہ قرآنی فکر کا سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا ہی مقصود بالذات نہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ انسانی سیرت میں پاکیزگی اور کردار میں بلندی پیدا ہو۔ یہی وہ مقیاس ہے جس سے ہمیں اپنی کوششوں کے نتائج کو ماپنا اور تولنا چاہیئے۔

۳۔ قرآنی فکر کی رو سے سب سے پہلی تبدیلی جو پیدا ہونی چاہیئے اسے خود اللہ تعالیٰ نے اولین قرآنی

جماعت کو مخاطب کرکے ان الفاظ میں بتایا ہے کہ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (۳/۱۰۳) تم خدا کی اس نعمتِ کبریٰ کو یاد کرو جو اس نے تمہارے حال پر ارزاں فرمائی۔ تم اس سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دلوں میں اس طرح ایک دوسرے کی الفت ڈال دی کہ تم دو قالب یک جان ہو گئے۔ اور یوں اس نے تمہیں اپنی نعمت سے بھائی بھائی بنا دیا۔ چونکہ آیت کی ابتدا ہوئی ہے وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا سے (یعنی تم سب مل کر خدا کی اس رسّی۔ قرآن کریم۔ کو مضبوطی سے تھامے رہو) اس لئے قرآن کریم سے وابستگی وہ نعمت ہے جس سے دشمن بھی ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن جاتے ہیں۔ اور یہ محض ایک نظری تعلیم نہیں بلکہ یہ کہہ کر کہ (تم یوں بھائی بھائی بن گئے) اس کی وضاحت کی قرآن سے وابستگی کا یہ عملی نتیجہ خود تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ لہٰذا، قرآنی فکر سے وابستگی کا پہلا مظاہرہ اس سے ہونا چاہیئے کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بن جائیں۔ ایسے بھائی جن کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ اخوت اور الفت ایسی بے بہا متاع تھی کہ اللہ تعالےٰ نے نبی اکرمؐ سے کہہ دیا کہ اگر تو ساری دنیا کی دولت بھی صرف کر دیتا تو یہ چیز پیدا نہ ہو سکتی۔ یہ صرف خدا نے (قرآن کریم کی وساطت سے) پیدا کی۔ (۸/۶۳)

یہ ہے، برادرانِ گرامی قدر! وہ پہلی بنیادی تبدیلی جو قرآنی تعلیم سے وابستگی کا لازمی اور فطری نتیجہ ہونی چاہیئے۔ آیئے ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں کہ کیا ان میں واقعی ایسی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے جس سے ہم ایک دوسرے کے بھائی بن گئے ہیں؟ اس محاسبۂ خویش کے بعد ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم نے ہم پر کیا اثر کیا ہے؟ اگر ہم میں یہ تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآنی تعلیم کو ذہنی طور پر تو قبول کیا ہے لیکن وہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اتری ——— اور قرآن کریم نے تو ایمان کی تعریف ہی یہ بتائی ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں میں اتر چکا ہو۔ (۴۹/۱۴)۔

سوچیے، عزیزانِ من! کہ یہ بڑی گہری سوچ کا مقام ہے۔

۲۔ اگلی بات سوچنے کی یہ ہے کہ جب ہم لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں تو کیا ہمارا معاملہ دیانت۔ امانت۔ صداقت اور انصاف پر مبنی ہوتا ہے یا ہم بھی وہی کچھ کرتے ہیں جو آج دنیا کا عام چلن ہے۔ اگر ہم بھی وہی کچھ کرتے ہیں تو معاف فرمایئے! اس قسم کی قرآن فہمی سے کچھ حاصل نہیں۔ جن معاملات میں ہم خود فیصلے کرنے کے مجاز ہیں اگر ہم ان میں بھی دیانت اور انصاف کو ملحوظ نہیں رکھتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے سمجھنے سے ہمارے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس نقطۂ نگاہ سے بھی اپنا محاسبہ کریں اور دیکھیں کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔

۴۔ میں آج کی اس نشست میں صرف ان دو نقاط کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں اس کے بعد میں نے سوچا ہے کہ جب تک کنونشن منعقد نہ ہو ہر ماہ آپ دوستوں سے اس طرح کچھ باتیں کر لیا کروں۔ آئندہ ماہ میں اس کی وضاحت کروں گا کہ ہمارے ہاں وہ کون سی بنیادی خرابیاں ہیں جن کی وجہ سے اس قسم کی ابتدائی تبدیلیاں بھی ہمارے اندر پیدا نہیں ہوتیں۔

میری مصروفیتیں

اکثر احباب مجھ سے دریافت کرتے رہتے ہیں کہ مفہوم القرآن کے بعد میری تصنیفی مصروفیات کیا ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے متعلق بھی احباب سے کنونشن میں گفتگو کرتا لیکن چونکہ اب کنونشن کا انعقاد اکتوبر پر ملتوی ہو گیا ہے اس لئے اس سلسلہ میں مختصر طور پر کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ سب سے پہلے یہ کہ کافی عرصے سے میں انگریزی زبان میں قرآنی لٹریچر کی تیاری میں مصروف ہوں۔ اس ضمن میں، قرآن کریم کی بنیادی تعلیم پر مشتمل کتابوں کے علاوہ مفہوم القرآن کا انگریزی ترجمہ سب سے اہم ہے۔ بحمد للہ کہ وہ ترجمہ ساتھ کے ساتھ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

۲۔ میں سمجھتا ہوں کہ لغات القرآن اور مفہوم القرآن کے بعد قرآن کریم کی تشریح اور تفہیم کے سلسلہ میں مزید کچھ مرتب کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی لیکن احباب کے تقاضوں نے بتایا کہ ابھی کچھ اور ضرورت ہے چنانچہ اس سلسلے میں اب میں نے تبویب القرآن کا کام ہاتھ میں لیا ہے۔ تبویب القرآن سے مراد یہ ہے کہ ایک عنوان لے کر پورے کے پورے قرآن کی متعلقہ آیات کے اشارات مع حوالہ اس کے نیچے دے دیئے جائیں تاکہ آپ جس موضوع کے متعلق چاہیں قرآن کی ساری تعلیم بیک وقت آپ کے سامنے آجائے۔ میں نے اپنی سہولت کے لئے اس قسم کی تبویب پہلے کر لی تھی لیکن وہ عام اشاعت کے لئے نہیں تھی۔ اس لئے اس کا انداز اور تھا۔ اب اسے اس مقصد کے لئے مرتب کیا جا رہا ہے نیز سلسلہ معارف القرآن بھی تبویب ہی کی بنیادوں پر مرتب کیا گیا تھا لیکن ایک تو اس میں عنوانات محدود ہیں اور دوسرے ہر عنوان کے تحت قرآن کریم کی تمام آیات درج نہیں کی گئیں۔ ضروری متعلقہ آیات درج کی گئی ہیں۔ تبویب القرآن میں آیات بالاستیعاب درج ہوں گی اور عنوانات بہت زیادہ ہوں گے اور ایک ہی آیت بعض اوقات متعدد عنوانات کے تحت لکھی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کی تکمیل کے لئے کافی وقت درکار ہوگا۔ بہرحال اسے میں نے شروع کر دیا ہے والاتمام من اللہ۔

(۳) علاوہ بریں ایک کتاب خالص احکام القرآن کے متعلق بھی میرے پیش نظر ہے۔ اس کا ابتدائی خاکہ

مرتب ہو چکا ہے۔ آخری ترتیب کی باری شاید تبویب القرآن کی تکمیل کے بعد آئے۔ واللہ المستعان۔

۴۔ جہاں تک کتابوں کی اشاعت کا تعلق ہے "انسان نے کیا سوچا" کا دوسرا حصہ۔ خدا نے کیا کہا۔ مرتب شدہ رکھا تھا۔ (اس کتاب کا نام ــــ اسلام کیا ہے ــ بھی تجویز کیا گیا تھا) اس پر نظرِ ثانی کر کے اسے کتابت کے لئے دیا جا رہا ہے۔

۵۔ میرے مضامین کا اگلا مجموعہ بھی طباعت کے لئے تیار ہے۔

۶۔ حضورؐ نبی اکرم کی حیاتِ طیبہ پر مشتمل کتاب ــــ معراج انسانیت ــــ کا سابقہ ایڈیشن ختم ہو چکا ہے۔ اس کے جدید ایڈیشن کے لئے پوری کتاب پر نظرِ ثانی کی گئی ہے اور ترتیب میں بھی کچھ تبدیلی کی گئی ہے۔

۷۔ ان کے علاوہ ابھی میرے ذمے کئی ایک "قرضے" باقی ہیں جن کے چکانے کے احساس سے میں ہر وقت گراں بار رہتا ہوں۔ قرآن کریم اور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے بعد میں سب سے زیادہ رہینِ کرم ہوں حضرت عمر فاروقؓ کی بصیرتِ قرآنی کا جو قرآنی نظام کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے میرے لئے مشعلِ ہدایت بنی۔ آپؓ کی اس حقیقت افروز بصیرت کے متعلق بھی مجھے کچھ لکھنا ہے تاکہ اسلام کے اس بطلِ جلیل اور قرآنی نظام کے اس عملی شارح کی عظمت کا صحیح تصور اور نظامِ ربوبیت کا محسوس نقشہ سامنے آ سکے۔

۸۔ ہمارے زمانے میں سرسیدؒ، اقبالؒ اور جناحؒ نے ایک اسلامی مملکت کے قیام کے امکانات روشن کرنے کے سلسلہ میں اپنے اپنے انداز میں جو کوششیں کی ہیں ان کے احساس سے بھی میری گردنِ تشکر خمیدہ ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے، یہ احساس ماضی کے دھندلکے میں گم ہوتا جا رہا ہے کہ اس تحریکِ عظیم کا بنیادی مقصد کیا تھا جو سرسید کے اُفقِ ذہنی سے ابھری اور اس خطۂ زمین کے حصول پر منتج ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس تحریک کے فکری اور قرآنی پہلوؤں کا منضبط اور محفوظ کرنا بھی ضروری ہے تاکہ آنے والی نسلوں کو معلوم تو ہو سکے کہ ان کوششوں کا مقصد کیا تھا کہ اور انسانی اور قرآنی نقطۂ نگاہ سے ان کی اہمیت کیا۔

یہ ہے مختصر سی تفصیل میری موجودہ تصنیفی مصروفیات کی، اور یہ ہیں میرے پیشِ نظر قلمی عزائم۔ اللہ تعالیٰ مجھے ان کی تکمیل کے لئے ہمت، عمر اور صحت عطا کرے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اس سلسلہ میں احباب کے مخلص مشورے میرے لئے باعثِ شکر گزاری ہوں گے۔

والسلام

پرویز

بزم ہائے طلوعِ اسلام کی ماہانہ رپورٹیں

ڈھاکہ

۵ـ اپریل کی صبح کو بزم کا ماہانہ اجلاس ہوا۔ اپنی علالت اور ڈاکٹروں کی ہدایت کے باوجود محترم نبی احسن صاحب نے بڑے ولولے سے اجلاس میں شرکت کی۔ اور اپنے ٹرانسسٹر ٹیپ سے پرویز صاحب کی بصیرت افروز تقریر ـ "انسان کے بنیادی حقوق" ـ سنانے کا اہتمام کیا۔ مفکرِ قرآن کا یہ خطاب بڑی اثرانگیز کیفیت لئے ہوئے تھا۔ اس کے بعد "حاصلِ مطالعہ" کے مستقل موضوع کے سلسلے میں مختلف احباب نے اپنے اپنے خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا۔ یہ مستقل موضوع قرآنی فکر کی پختگی کے سلسلے میں بڑا مفید ثابت ہو رہا ہے۔

پرویز صاحب کے درسِ قرآن کی ٹیپ ریکارڈنگ کے سلسلے میں بزم بعض خصوصی انتظامات بروئے کار لانے پر غور کر رہی ہے۔ محترم نبی احسن صاحب نے بھی اپنے ٹرانسسٹر ٹیپ کے ذریعہ اس دعوتِ قرآنی کی عام نشر و اشاعت کا عزم کیا ہے۔

بزم نے ماہنامہ طلوعِ اسلام کے لئے اشتہارات کی ضرورت پوری کرنے پر توجہ مبذول کی ہے اور امید ہے کہ اسے اس مہم میں پوری کامیابی حاصل ہوگی۔ طلوعِ اسلام کی براہِ راست ایجنسی بھی بزم نے حاصل کرلی ہے۔ ان پرچوں کو برائے فروخت ہر ماہ ایک بک اسٹال کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ کامیابی سے جاری ہے۔ اور طلوعِ اسلام کے شائع کردہ پمفلٹوں کو بنگلہ زبان میں منتقل کرنے کے لئے معیاری قسم کے مترجم کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں اور اس انقلاب آفریں لٹریچر کے بنگلہ میں شائع ہو جانے سے قرآنی فکر عام ہوتا چلا جائے گا۔

لائل پور

بزم کی تجدید کے بعد یہاں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا سلسلہ پورے ولولے سے شروع ہے۔ بزم کے ہفتہ وار اجتماع باقاعدگی سے جاری ہیں۔ بزم نے ایک ٹیپ ریکارڈر کا بھی انتظام کرلیا ہے۔ اور ان اجتماعات میں مفکرِ قرآن کے درسِ قرآن کا سلسلہ بذریعہ ٹیپ شروع کر دیا گیا ہے۔ اراکینِ بزم کے علاوہ دیگر صاحبِ ذوق اصحاب ان اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں۔ طلوعِ اسلام کی پیش کردہ دعوتِ قرآنی کو یہاں کے ہر صاحبِ فکر و بصیرت تک پہنچانے کے لئے بعض اہم تجاویز بزم کے زیرِ غور ہیں اور جلد ہی انہیں بروئے کار لانے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔

ایک اور قرآنی دوست کی جُدائی

سنہ ۱۹۵۸ء میں جب میں کراچی سے منتقل ہو کر لاہور آیا ہوں، تو یہاں کے جدید احباب میں سے سب سے پہلے جن سے تعارف ہوا، وہ تھے شیخ عطاء اللہ صاحب۔ سب سے پہلے اس لئے کہ حسنِ اتفاق سے ان کا مکان، میرے مکان کے سامنے تھا۔ ایک ریٹائرڈ گورنمنٹ سرونٹ۔ پیرانہ سال لیکن اس قدر جواں ہمت کہ جوانوں کو بھی اس پر رشک آئے۔ ہر وقت ملّت کے غم میں ڈوبے ہوئے لیکن خالی مرثیہ پڑھنے والے نہیں بلکہ مفید و بعمل کام کرنے والے۔ جب دیکھئے قوم کے اجتماعی فلاح و بہبود کے کسی نہ کسی کام میں مصروف۔ ان کا قدیم تعلق قرآنی گھرانے سے تھا۔ گجرات کے شیخ عطاء اللہ مرحوم جن کی نایاب کتاب ــــ جمع القرآن ــــ ادارہ کی طرف سے شائع کی گئی تھی ــــ ان کے قریب ترین بزرگوں میں سے تھے۔ انہوں نے قرآنی ذوق اسی فضا سے جذب کیا تھا۔

اس تعلق سے میرے ساتھ بڑے مخلصانہ مراسم۔ ادبی ذوق بھی بڑا حسین اور شگفتہ۔ فرصت کے لمحات میں اکثر میرے ہاں آجاتے اور انہی موضوعات پر گفتگو رہتی ــــ فکر و نظر کی ہم آہنگی کی ملاقاتیں بھی کس قدر وجد نشاط پرور ہوتی ہیں!

اتوار کی صبح حسبِ معمول درس میں آئے۔ سہ پہر کو دل کا دورہ پڑا۔ میں برادرِ عزیز شیخ طلوع الحق صاحب کی معیت میں خیریت پرسی کے لئے ہسپتال گیا تو اگرچہ ضعفِ قلب سے آنکھیں بند تھیں لیکن حواس بجا تھے۔ اپنے مخصوص تبسم سے بہت کچھ کہہ گئے۔ حالت کچھ ایسی مایوسی کی نہیں تھی لیکن تیسری شام معلوم ہوا کہ دُنیا سے سفر کر گئے ــــ "خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں" اس قسم کے مخلص احباب، ہمارے پچھلے دور کی یادگار ہیں۔ جو جگہ یہ خالی کر جاتے ہیں اُسے پُر کرنے والے اب بمشکل ملتے ہیں۔ اسی لئے ان کی مفارقت دل پر ایک داغ چھوڑ جاتی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو توفیقِ صبر عطا کرے۔

غمگسار
پرویز

دیگر مصنفین و ناشران کی مشہور کتابیں

قارئین طلوع اسلام میں سے اکثر دیگر مصنفین اور ناشرین کی کتابوں کی تفصیل دریافت کرتے رہتے ہیں اور ان کی فرمائشیں بھی بھیجتے رہتے ہیں۔ ان کی سہولت کے لئے ہم نے انتظام کیا ہے کہ باہر کی کتابیں بھی مہیا کر دی جایا کریں۔ ذیل کی کتابوں میں سے بعض کا تعارف ان کے ناشرین کی طرف سے کرایا گیا ہے۔ آپ کو مطلوب ہوں ہمیں اطلاع دیں۔ خرچ ڈاک قیمت کتاب سے الگ ہوگا۔

امام ابو حنیفہؒ۔ سات سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل امام اعظمؒ کے سیرت و کردار پر مشہور مصری عالم محمد ابو زہرہ کی تصنیف کا رئیس احمد جعفری کے قلم سے اردو ترجمہ۔ قیمت ۱۵ روپے۔

امام مالکؒ محمد ابو زہرہ (مصری) کی تصنیف کا ترجمہ۔ ترجمہ عبید اللہ قدسی۔ امام مالکؒ کے سوانح حیات پر مشتمل تقریباً پانچ صد صفحات کی مفصل کتاب مع دیدہ زیب گرد پوش۔ قیمت ۱۰ روپے۔

آثار امام شافعیؒ محمد ابو زہرہ کی تصنیف کا رئیس احمد جعفری کا اردو ترجمہ امام شافعیؒ کے دور کے فقہی رجحانات فقہ اسلامی کے ارتقاء اور امام موصوف کی اجتہادی کاوشوں پر بھرپور تحقیقی تبصرہ۔ ضخامت ساڑھے پانچ صد صفحات قیمت ۱۲ روپے۔

آثار امام محمدؒ و امام ابو یوسفؒ۔ محمد ابو زہرہ کی تحقیق و تاریخی پیشکش۔ رئیس احمد جعفری کا اردو ترجمہ۔ امام اعظمؒ کے شہرہ آفاق شاگردان رشید کے اجتہادات اور فتاویٰ پر مشتمل مجموعہ۔ ضخامت ۶۰۰ صفحات قیمت ۵۰/۱۲ روپے۔

سیرۃ النبیؐ (کامل) حضور نبی اکرمؐ کی سیرۃ مقدسہ پر ابن ہشام کی تصنیف۔ مولانا عبد الجلیل صدیقی کا اردو ترجمہ۔ دیدہ زیب کتابت و طباعت دو جلدوں میں قیمت ۳۲ روپے۔

رحمۃ للعالمین۔ قاضی محمد سلیمان سلمان کی بلند پایہ تصنیف حیات طیبہ پر تین جلدوں میں۔ جلد اول قیمت ۷/۵۰ مجلد ۳/۶ روپے۔ جلد دوم قیمت ۶.۵۰ روپے بلا جلد ۵.۵۰ روپے جلد سوم قیمت ۶.۵۰ روپے بلا جلد ۵.۵۰ روپے۔

ٹیپو سلطان - شیر میسور سلطان ٹیپو شہید علیہ الرحمہ کی غیرت اسلامی، مجاہدانہ کردار اور سرفروشانہ کارناموں پر مشہور مورخ محمود بنگلوری کی نذر تحسین۔ قیمت ۵/۶۰ روپے۔

محمدؐ رسول اللہ۔ مصری ادیب و مورخ توفیق الحکیم کی مشہور کتاب "محمدؐ" کا اردو ترجمہ —— قیمت ۵ روپے۔

ابو بکر صدیقؓ۔ مصر کے نامور مورخ محمد حسین ہیکل کی شہرہ آفاق تصنیف کا اردو ترجمہ۔ قیمت -/۷ روپے

عمر فاروق اعظمؓ محمد حسین ہیکل مصری کی معرکۃ الآرا تصنیف اردو میں۔ قیمت -/۲۰ روپے۔

عمرو بن العاص۔ فاتح مصر عمرو بن عاص کے فاتحانہ کارناموں پر مشتمل حسن ابراہیم مصری کی تصنیف کا اردو ترجمہ۔ قیمت -/۵ روپے۔

فلسفۂ شریعت اسلام۔ نامور مستشرق صبحی محمصانی کی اسلامی قانون سازی کے موضوع پر عظیم الشان کتاب کا اردو ترجمہ۔ قیمت -/۵ روپے۔

نفسیات واردات روحانی ۔ تصنیف ولیم جیمز قیمت -/۱۰ روپے۔

تشکیل انسانیت۔ شہرہ آفاق مستشرق بریفالٹ کی شہرۂ آفاق تصنیف (MAKING OF HUMANITY) کا اردو ترجمہ۔ قیمت -/۵ روپے۔

میراث اسلام۔ طامس آرنلڈ اور الفرڈ گلوم کی مشترکہ پیشکش۔ مولانا عبدالمجید سالک کا اردو ترجمہ قیمت ۹.۵۰ روپے۔

مکتوبات سرسیدؒ۔ سرسید کے مکتوبات کا مجموعہ مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ قیمت -/۱۰ روپے۔

مقالات سرسیدؒ۔ مرتبہ مولانا محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ (دس حصوں میں) حصہ اول ۴.۵۰ حصہ دوم ۲.۵۰ حصہ سوم ۳.۰۰ حصہ چہارم ۵.۲۵ حصہ پنجم ۴.۵۰ حصہ ششم ۴.۵۰ حصہ ہفتم ۳.۵۰ حصہ ہشتم ۱.۷۵ حصہ نہم ۴.۵۰ حصہ دہم ۲.۷۵ روپے۔

مسلمانوں کی سیاسی تاریخ۔ حسن ابراہیم مصری کی تصنیف کا اردو ترجمہ۔ قیمت -/۱۰ روپے۔

تنقیدات طٰہٰ حسین۔ نامور مصری مورخ اور عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تصنیف اردو میں۔ قیمت ۴.۵۰ روپے۔

ذکر اقبالؒ۔ مصنفہ مولانا عبدالمجید سالک۔ قیمت -/۵ روپے۔

فکر اقبالؒ۔ تصنیف و تالیف ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ قیمت -/۱۰ روپے۔

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ علامہ اقبالؒ کے علم افروز اور فکر انگیز انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ سید نذیر نیازی کے قلم سے۔ قیمت -/۸ روپے۔

افکار ابن خلدون۔ فلسفہ تاریخ کے شہرۂ آفاق عالم اور نامور مستشرق علامہ ابن خلدون کے علمی و دینی اور عمرانی و تاریخی نظریات اور تصورات کا ایک تجزیہ صفحات ۲۳۲۔ قیمت ۴.۲۵ روپے۔

تاریخ جمہوریت۔ نوع انسانی کی اجتماعی زندگی کے آغاز سے عصر حاضر تک جمہوریت کے نشوو ارتقاء کی مفصل روئیداد۔ ضخامت ۵۰۲ صفحات قیمت -/۸ روپے

سرسید اور اصلاح معاشرہ۔ اسلامی ہند میں اصلاح معاشرہ سے متعلق سرسیدؒ کی سعی مسلسل کا تفصیلی تذکرہ۔ صفحات ۲۵۵۔ قیمت ۴.۲۵ روپے۔

حیات محمدؐ۔ مصر کے نامور مورخ اور صحافی محمد حسین ہیکل کی تاریخی پیش کش اردو زبان میں صفحات ۱۲۴۱۔ قیمت ۲۰.۵۰ روپے۔

ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

ضرورت رشتہ ایک سینیئر سب آف نیٹ زمیندار ریلوے ملازم کے لئے ایک ہم آہنگ رفیقۂ حیات کی ضرورت ہے۔ جس کی عمر پچیس تیس سال تک ہو۔ مقامی یا مہاجر اور پنجابی یا ہندوستانی کی کوئی قید نہیں۔ معرفت ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ۔ لاہور

نقد و نظر

الخطبات الاحمدیہ

سرسیدؒ ذہنی طور پر جس قدر بلند تھا اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے دل میں اسلام کے صدر اور نبی اکرمؐ کی ذات گرامی سے عشق کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ ۱۸۶۱ء میں یو۔پی کے لفٹننٹ گورنر سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" شائع ہوئی جو نہایت گمراہ کن واقعات اور بیہودہ الزامات سے بھری ہوئی تھی۔ آج یہ بات کچھ زیادہ اہم نہیں دکھائی دیتی۔ لیکن ۱۸۶۱ء کا زمانہ ذہن میں رکھیے اور اس حقیقت کو پیش نظر کہ کتاب کا مصنف یوپی کا گورنر تھا۔ سرسید کا دل تڑپ اٹھا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ اس کتاب کا مسکت جواب لکھا جائے گا۔ یہ تو تھا سرسیدؒ کی جرأت کا عالم۔ لیکن اس کے بعد اس کی ہمت ملاحظہ فرمائیے۔ اس نے دیکھا کہ کتاب کا جواب لکھنے کے لئے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو ہندوستان میں دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس مقصد کے لئے سرسیدؒ لندن روانہ ہو گیا۔ وہاں ضروری کتابیں فراہم کیں۔ انگریزی اور لاطینی کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ پھر اس کتاب کا جواب لکھا۔ اور اس کا خلاصہ انگریزی زبان میں شائع کرایا۔ "الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرت محمدیہ"۔ اسی (اردو) کتاب کا نام ہے۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اب اسے لفیس اکیڈمی کراچی نے شائع کیا ہے۔ کتاب ۵۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت طباعت اچھی ہے اور مجلد کی قیمت ۱۲ روپے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب

(۱) سر ولیم میور کی پوری کتاب کا جواب نہیں۔ صرف جلد اول کا جواب ہے۔

(۲) عیسائیوں کی طرف سے جس قسم کے اعتراضات اس زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ اب ان کی

اہمیت خود ہی کم ہو گئی ہے۔

(۳) کتاب اس دور کی تصنیف ہے جب سرسیدؒ کے ذہن پر روایاتی اثر موجود تھا۔ جس کی وجہ سے کتاب میں روایاتی استقام بھی پائے جاتے ہیں۔

بایں ہمہ، یہ عمدہ علمی کاوش و تحقیق کا نتیجہ ہے اس لئے قابلِ قدر۔

جس طرح تاج محل آج بھی اسی طرح تر و تازہ اور شگفتہ و شاداب ہے جس طرح آج سے تین سو سال پہلے۔ اسی طرح بعض کتابیں بھی زندہ رہنے والی ہوتی ہیں۔ اس قسم کی کتاب محترم پرویز صاحب کی زندۂ جاوید تصنیف

سلیم کے نام خطوط

ہے۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں اس کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں صحیح انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

جلد اوّل ———— ۸ روپے
جلد دوم ———— ۶ روپے
جلد سوم ———— ۶ روپے

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور سے بھی مل سکتی ہے

حکمتِ ولی اللّٰہی

مدیر الرحیم سے ایک سوال

ماہنامہ الرحیم شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا ترجمان اور حکمت ولی اللّٰہی کا مبلغ اور شارح ہے۔ اس کی اپریل ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں مدیر (محمد سرور صاحب) کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے — دین کے دو جزو — حکمت اور فقہ — اس میں دین کے اصول وجزئیات کے متعلق عمومی بحث بھی ہے۔ اور شاہ ولی اللہ کے مسلک کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ ایک چیز ہوتی ہے دین کے اصول اور دوسری چیز ہے ان اصولوں کی روشنی میں مرتب کردہ احکام وقوانین۔ دین کے اصول غیر متبدل اور عالمگیر ہوتے ہیں۔ اور احکام وقوانین کی تدوین میں زمان ومکان کی خصوصیات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اس لئے احوال وظروف کی تبدیلی سے ان میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ

> دین اسلام کی اس عالمگیر تعلیم کو جو تمام مذاہب وادیان کی اصل ہے، سب سے پہلے سرزمینِ حجاز میں عملی جامہ پہنایا گیا۔ یہ جامہ اس عالمگیر تعلیم کا ایک خاص زمان ومکان سے اس کے ربط وتعلق کا عملی مظہر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں اس زمان ومکان اور اہل حجاز کے طبائع وحالات کا یقیناً خیال رکھا گیا۔ اس عملی مظہر کو جسے سنت کا نام دیا گیا ہے۔ دین اسلام کی عمومی وابدی تعلیم کا درجہ دینا ٹھیک نہیں۔ .... (صلا۲)

آگے چل کر تحریر ہے۔

> مولانا سندھی کے الفاظ میں اسلام کی تعلیم قرآن مجید میں منضبط ہے اور وہ غیر متبدل ہے۔ جہاں کہیں اساسی تعلیم پر عمل ہوتا ہے مخاطبین کے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفصل قوانین بنائے جاتے ہیں۔ مولانا کے نزدیک یہ سنت تھی اور اس کا صحیح ترجمہ

موطا امام مالکؒ۔ (ص۳۳)

یہاں تک بات صاف ہے کہ

(۱) قرآن کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ ابدی، عالمگیر اور غیر متبدل ہے۔ لیکن

(۲) قرآنی اصولوں کی روشنی میں جو جزئی احکام نبی اکرمؐ یا بعد میں خلفائے راشدین یا ائمہ فقہ نے مدون فرمائے ان میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اس کے بعد اس مضمون میں کچھ ایسی باتیں آگئی ہیں جن سے چند شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اس میں لکھا ہے کہ

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں اس قوم کی عادات، شعائر، تعزیرات اور انتظامات کا لحاظ رکھا گیا ہے جس میں وہ نازل ہوا اور جو اس کے اولین مخاطب تھے لیکن اس سے قرآن کی عمومیت اور ہمہ گیریت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کیونکہ ایسے احکام جو ان عادات اور حالات کی بنا پر ہوتے ہیں ان کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ مولانا سندھیؒ اس بارے میں فرماتے تھے کہ قرآن میں کہیں کہیں جو اس قسم کے احکام ہیں ان کی حیثیت ایک عملی مثال کی ہے۔ یعنی عرب کے ان حالات میں قرآن مجید کے عمومی پیغام کو صرف ان احکام کے ذریعہ ہی بروئے کار لایا جا سکتا تھا۔ (ص۳۵)

اسی سلسلہ میں محترم نامہ نگار نے مولانا شبلی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

اس اصول سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ شریعت اسلامی میں چوری، زنا، قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں ان میں کہاں تک عرب کی رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ ان سزاؤں کا بعینہا اور بالخصوصہا پابند رہنا کہاں تک ضروری ہے۔ (ص۳۶)

یہ ظاہر ہے کہ

(۱) قرآن کریم میں بیشتر دین کے اصول دئے گئے ہیں لیکن اس میں کچھ احکام و تعزیرات بھی ہیں۔

(۲) باقی احکام و تعزیرات، نبی اکرمؐ نے مدون فرمائے تھے۔

جہاں تک نبی اکرمؐ کے مدون فرمودہ احکام وغیرہ کا تعلق ہے، یہ بات پہلے واضح ہو چکی ہے کہ احوال و ظروف کے بدلنے سے ان میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک ان احکام و تعزیرات میں بھی تبدیلی کی جا سکتی ہے جو خود قرآن کریم میں درج ہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر ہم محترم مدیر الرحیم سے درخواست کریں گے کہ وہ براہ کرم وضاحت سے بتائیں کہ اس باب میں شاہ صاحبؒ کا مسلک کیا ہے؟ یعنی کیا وہ قرآن کریم میں دئے ہوئے احکام و تعزیرات کو بھی قابل تغیر و تبدل سمجھتے ہیں۔ اس نکتہ کی وضاحت

اس لئے بھی ضروری ہے کہ زیر تبصرہ مضمون میں شاہ صاحبؒ کے جو اقوال نقل کئے گئے ہیں ان سے سعاملہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ان کا یہ قول۔

> اس طرح شریعت میں ان علوم و اعتقادات و عادات کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو قوموں میں مخزون اور جاری و ساری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ بنی اسرائیل میں حرام ہوا اور بنی اسمٰعیل پر حرام نہ ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ کھانوں میں پاک اور نجس کی تفریق عرب کے مذاق پر محمول کی گئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ بھانجی سے شادی کرنا ہمارے مذہب میں حرام ہے اور یہود کے ہاں نہیں۔ (ص)

اس میں شریعت کا لفظ بڑا ابہام و اشتباہ پیدا کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ

(۱) اونٹ کا گوشت قرآن کریم کی رُو سے حلال ہے۔

(۲) کھانوں کے پاک اور نجس (حرام و حلال) کی ایک تفریق خود قرآن کریم میں کی گئی ہے۔

اور دوسری تفریق احادیث میں ہے (یعنی نبی اکرمؐ کی پیدا کردہ)۔

(۳) بھانجی سے شادی کرنا قرآن کریم کی رُو سے حرام ہے۔

اگر یہ باور کر لیا جائے (جیسا کہ اقتباس بالا سے مترشح ہوتا ہے) کہ جو احکام خود قرآن کریم میں دیے گئے ہیں ان میں بھی عربوں کے مذاق، عادات، اعتقادات و رسوم کا لحاظ رکھا گیا ہے، تو ان احکام کی عمومیت اور ابدیت واقعی باقی نہیں رہتی۔

بہر حال، وضاحت طلب بات یہ ہے کہ کیا شاہ صاحبؒ کے نزدیک ان احکام و تعزیرات میں بھی تبدیلی کی جا سکتی ہے جو خود قرآن کریم میں دیے گئے ہیں یا یہ تبدیلی صرف ان احکام میں ہو سکتی ہے جنہیں دین کے اصولوں کی روشنی میں نبی اکرمؐ نے مدون فرمایا تھا؟ ہمیں امید ہے کہ مدیر الرحیم اس اہم نکتہ کی وضاحت فرما کر ہمیں شکر گزار فرمائیں گے۔

مُفت

مجرب دوا برائے دمہ۔ درد گردہ و پتھری

حاجی محمد دین۔ سیشیخ آئل نیکٹری متصل گنیش کھوپرا ملز لائنس روڈ کراچی

نوٹ:۔ جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

بچوں کا صفحہ

السّلام علیکم

ندیم کو آج بہت زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ اسکول سے واپسی پر گھر میں داخل ہوتے ہی اس کے منہ سے نکلا: "امی! مجھے بڑی سخت بھوک لگی ہے۔ جلدی سے کھانا دیجئے۔" امّی بولیں: "آؤ بیٹا کھانا تو تیار ہے لیکن کیا آج تمہیں اتنی بھوک لگی ہے کہ تم سلام کرنا بھی بھول گئے۔" "اوہ! امّی معاف کیجئے گا۔ میں سچ مچ بھول ہی گیا۔" ندیم نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ "چلو کوئی بات نہیں۔ انسان سے بھول تو ہو ہی جاتی ہے مگر کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ایک دفعہ کی بھول کو بار بار نہ دہرایا جائے۔" امّی نے ندیم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ پھر کہا: اب تم منہ ہاتھ دھوکر کھانا کھاؤ۔ پھر میں تمہیں اس سلام کے متعلق چند ایسی باتیں بتاؤں گی جو تم ابھی نہیں جانتے مگر جن کا جاننا تمہارے لئے ضروری ہے۔ لیکن پہلے تمہاری بہن نصرت بھی اسکول سے آجائے پھر دونوں غور سے سننا۔ اتنے میں نصرت بھی خوش خوش اپنا بستہ جھلاتے کمرے میں داخل ہوئی۔ السلام علیکم امّی جان۔ السلام علیکم بھائی جان! نصرت نے مسکراتے ہوئے میٹھے لہجے میں صاف آواز سے کہا۔ امّی اور ندیم نے وعلیکم السلام

کہتے ہوئے اسے پیار کیا اور تینوں کھانے میں شریک ہو گئے۔ کھانے فراغت ہوئی تو دونوں بچے امّی کے پاس جا کر سلیقے سے بیٹھ گئے اور سلام کا مطلب جاننے کے لئے اپنے اشتیاق کا اظہار کیا۔ امّی کہنے لگیں: اچھا ندیم بیٹے! پہلے تم بتاؤ کہ السلام علیکم کے کیا معنی ہیں۔ جی امّی! اس کے معنی ہیں کہ آپ پر سلامتی ہو۔ ٹھیک کہا تم نے۔ میں نے تمہیں اس کے یہی معنی بتائے تھے۔ اور اب نصرت! تم یہ بتاؤ کہ اس کے جواب میں وعلیکم السلام کیوں کہتے ہیں؟ اس لئے امی! کہ اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ آپ پر بھی سلامتی ہو۔ درست بیٹی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم دونوں نے اس لفظ کے معنی یاد رکھے ہیں۔ اب میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ السلام علیکم کہنے کا اصل مقصد کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی آخری مکمل اور ہمیشہ رہنے والی کتاب قرآن مجید میں آپس میں السلام علیکم کہنے کی تاکید کیوں کی گئی ہے۔ ذرا غور سے سنو۔

دونوں بچے اور بھی متوجہ ہو کر بیٹھ گئے تو ان کی امی نے کہا بچو! یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ جب دو آدمی آپس میں ملتے ہیں تو باتیں شروع کرنے سے پہلے ایک دوسرے کو سلام دعا دیتے ہیں اور دُنیا میں ہر جگہ یہ طریقہ رائج ہے۔ ہم مسلمان اس ضرورت کو السلام علیکم کے لفظ سے پورا کرتے ہیں کیونکہ اس کے لئے قرآن مجید میں یہی لفظ آیا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ آپس میں گفتگو کرنے سے پہلے ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دے کر دونوں کے دل ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو جائیں کہ ہر بات اسی جذبہ

کے ماتحت کی جائے اور کسی قسم کی ناگواری یا کدورت کا احتمال ہی نہ رہے۔ دوسرے کی سلامتی چاہنے سے اس میں پہل کرنے والے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میری خواہش یہ ہے کہ آپ کی نشوونما پورے اور مکمل طریق پر ہو۔ آپ ہر طرح خیریت اور سلامتی سے رہیں۔ اور اگر اس کے لئے کسی وقت میری مدد کی ضرورت ہو تو میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ اس کے بعد جواب دینے والا بھی یہی الفاظ دہراتا ہے اور اسطرح دونوں ایک دوسرے کے دلی ہمدرد بن کر بات شروع کرتے ہیں۔ ندیم اور نصرت بڑے دھیان سے امی کی باتیں سن رہے تھے۔ امی بولیں۔ تم نے دیکھا بچو! اس السلام علیکم میں کس طرح پورے دین اسلام کا مقصد سمٹ کر آگیا ہے۔ اور آپس میں ہمدردی کرنے اور ایک دوسرے کے سامنے آنے کا یہ کیسا پاکیزہ اور مطمئن کرنے والا طریقہ ہے اسی لئے قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا (۴/۸۶) جب کوئی تمہیں زندگی بخش دعا دے تو تم اسے اس سے بھی بہتر دعا دو یا کم ازکم ویسی ہی دعا۔ کیوں ندیم بیٹے اور نصرت بیٹی! اب تم سمجھ گئے نا کہ السلام علیکم کیوں کہا جاتا ہے؟

امی نے پوچھا۔ ہاں امی جان! اب ہم نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ السلام علیکم کا مقصد کیا ہے، وہ بولے۔ امی نے دونوں کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ دیکھو میرے بچو! یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ قرآن مجید کے دیے ہوئے احکام کو محض لفظی طور پر دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہر لفظ کے اصلی معنی کو اپنے سامنے رکھ کر اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ (ثریا عندلیب)